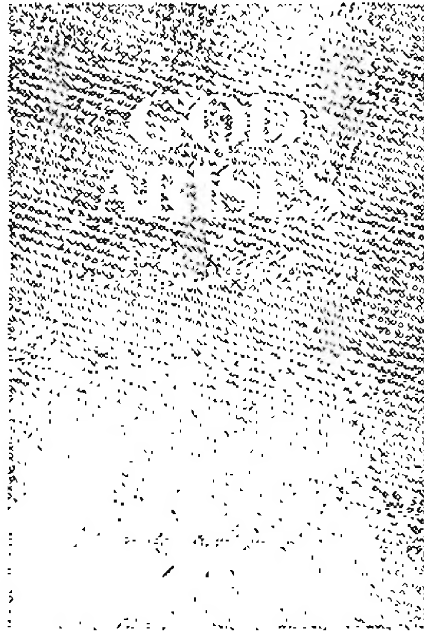
الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ISSN 0970-180X

ہر شام کے بعد دوبارہ نئی صبح آتی ہے
مگر صبح کو پانے والا صرف وہ شخص ہے
جو صبح کے آنے تک اس کا انتظار کرے

مئی ۱۹۸۸
شمارہ ۱۳۸



God Arises

By Maulana Wahiduddin Khan

This is the translation with some additions of *Mazhab Aur Jadeed Challenge*, translated into Arabic as *Al-Islam Yatahaddah*, which became a best-seller throughout the Arab world. It has also been translated into a number of other languages including Turkish, Malay, Serbo-Croatian (Yugoslavian), Sindhi, etc,, and has come to be accepted as a standard work on the Islamic position vis-à-vis modern thought.

"... in the fourteen hundred years of Islamic history, innumerable books on Islam have appeared. There are just a few books calling mankind to God which are clearly distinguishable from the rest because of the clarity and force with which they make their appeal. Without doubt, this book is one of that kind".

— Daily AL-AHRAM (Cairo)

Pages 265 ISBN 81-85063-14-1 (Pbk)
81-85063-17-6 (Hbd) Price Rs. 45

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۳۸ مئی ۱۹۸۸

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ ، فون: 697333, 611128

۴۰ منٹ کی آزادی

ٹائمس آف انڈیا (سکشن ۲ صفحہ ۸) کے شمارہ ۱۶ فروری ۱۹۸۸ میں ایک خبر چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ——— ۴۰ منٹ کی آزادی ختم ہوتی ہے:

40 minutes of freedom ends

اس خبر کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی جرمنی میں جیل کے اصلاحی قوانین کے تحت اس طریقہ کا تجربہ کیا جارہا ہے کہ ہفتہ میں ایک دن جیل کے بعض قیدیوں کو چھٹی دی جائے اور انھیں یہ موقع دیا جائے کہ وہ جیل کی بند فضا سے نکل کر باہر کی آزاد فضا میں گھوم سکیں۔

۱۴ فروری ۱۹۸۸ کا واقعہ ہے۔ مغربی جرمنی کے شہر لنگن (Lingen) میں دو قیدی اس نئے نظام کے تحت وقتی طور پر رہا کر دیے گئے تاکہ وہ جیل سے باہر جاکر "چھٹی" منا سکیں۔ مگر جلد ہی ان کی آزادی ختم ہو گئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جیل سے نکلتے ہی ایک ہوٹل میں گھس گئے جو جیل خانہ سے صرف ۲۰۰ میٹر کے فاصلہ پر واقع تھا۔ وہاں انھوں نے گڑبڑ شروع کر دی۔ ہوٹل کے آدمی نے فوراً پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ پولیس کی گاڑی آئی اور دونوں مجرمین کو پکڑ کر واپس لے گئی۔ آزادی کے صرف چالیس منٹ بعد دونوں دوبارہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند تھے:

Two convicts allowed out of prison on weekend leave found themselves back behind bars after just 40 minutes of freedom.

"۴۰ منٹ آزادی" کا یہ معاملہ جو جرمنی کے دو آدمیوں کے ساتھ پیش آیا، یہی تمام انسانوں کا معاملہ ہے۔ ہر شخص جو اس دنیا میں چل پھر رہا ہے، وہ صرف ۴۰ منٹ کے لیے چل پھر رہا ہے۔ ہر ایک کو صرف ایک محدود مدت تک کے لیے موقع دیا گیا ہے، اس کے بعد اسے پکڑ لیا جائے گا۔ جرمنی کے مذکورہ دو آدمیوں کو جرمنی کی پولیس نے پکڑا۔ اسی طرح تمام انسانوں کے اوپر خدا کی پولیس لگی ہوئی ہے اور اس بات کی منتظر ہے کہ کب "۴۰ منٹ" کی مدت پوری ہو اور وہ لوگوں کو عین حالت جرم میں پکڑ لے۔

آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو اس کی پوری زندگی بدل جائے۔

جدوجہد کی تربیت

رمضان کے مہینہ کو حدیث میں صبر کا مہینہ (شہر الصبر) کہا گیا ہے۔ صبر و استقامت بلاشبہ زندگی کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یہی تمام فتوحات اور کامیابیوں کا راز ہے۔ حقیقی روزہ صبر کی صفت پیدا کرتا ہے اور صبر ہی وہ چیز ہے جو تمام اعلیٰ کامیابیوں کا دروازہ ہے۔

روزہ کے لیے عربی لفظ صوم ہے۔ صوم کے اصل معنی ہیں رکنا۔ صائم کے معنی ہیں رکنے والا۔ قدیم زمانہ میں مشکل اوقات میں گھوڑا انسان کا سب سے بڑا ساتھی تھا۔ جنگ اور سخت قسم کے سفر میں وہ انسان کے کام آتا تھا۔ اس مقصد کے لیے تربیت دینے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ گھوڑے کو محدود مدت کے لیے بھوکا پیاسا رکھا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ سختی کو برداشت کر سکے۔ اس طرح کے تربیت یافتہ گھوڑے کو خیل صائم (روزہ دار گھوڑا) کہتے تھے۔ نابغہ نے میدان جنگ کی تصویر کشی میں گھوڑوں کے بارہ میں کہا ہے کہ کچھ گھوڑے روزہ والے تھے اور کچھ گھوڑے بغیر روزہ والے :

خیلٌ صیام وخیلٌ غیرُ صائمۃ

اس طرح انسان صائم سے مراد وہ انسان ہے جو کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے وقتی طور پر رک جائے۔ یہ رکنا اور پرہیز کرنا آدمی کے اندر برداشت کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ جب سختیاں پیش آئیں تو وہ ان کے مقابلہ میں پوری طرح جم سکے۔

رمضان کا مہینہ آدمی کے لیے اپنے نفس اور اپنی خواہشات سے لڑنے کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جب کہ مومن شیطانی طاقتوں کو زیر کر کے ان کے اوپر قابو پاتا ہے اور دوبارہ خدا کی بندگی کا عزم لے کر نئے سال میں داخل ہوتا ہے۔

تاریخ حیرت انگیز طور پر روزہ کی اس خصوصیت کی تصدیق کرتی ہے۔ چنانچہ روحانی مقابلہ کا یہ مہینہ اسلام کی تاریخ میں فوجی مقابلہ کا مہینہ بھی رہا ہے۔ اسلام اور غیر اسلام کے کئی بڑے بڑے معرکے اسی مہینہ میں پیش آئے۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند معرکوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے :

۱۔ غزوۂ بدر (رمضان ۲ ھ)
جب کہ رسول اور اصحاب رسول کو قریش کے اوپر فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔
۲۔ فتح مکہ (رمضان ۸ ھ) جس نے پورے عرب پر اسلام کو غالب کر دیا۔
۳۔ غزوۂ تبوک (رمضان ۹ ھ) جس نے رومیوں کے اوپر اہل اسلام کی دھاک قائم کر دی۔
غزوۂ تبوک رجب میں شروع ہو کر رمضان میں ختم ہوا۔
۴۔ فلسطین (رمضان ۱۵ھ) عمرو بن العاص نے فلسطین کو فتح کر کے بیت المقدس کو اسلام کے حدود سلطنت میں شامل کیا۔
۵۔ معرکہ اسپین (رمضان ۹۱ھ) جب کہ طارق بن زیاد نے اسپین میں کامیاب پیش قدمی کی۔
۶۔ سندھ (رمضان ۹۶ھ) محمد بن قاسم سندھ میں داخل ہوئے اور وہاں اسلام کو پھیلایا۔
۷۔ دولت اندلس (رمضان ۱۳۸ھ) عبدالرحمٰن الداخل اندلس میں داخل ہوئے اور وہاں باقاعدہ دولت امویہ قائم کی۔
۸۔ صقلیہ (رمضان ۲۱۲ ھ) زیاد بن الاغلب نے جزیرہ صقلیہ کو فتح کیا۔
۹۔ حروب صلیبیہ (رمضان ۵۸۴ھ) حطین کی مشہور جنگ میں صلاح الدین ایوبی نے صلیبی طاقتوں پر فتح حاصل کی۔
۱۰۔ معرکہ عین جالوت (رمضان ۶۵۸ ھ) جس نے تاتاریوں کو شکست دے کر مسلم دنیا میں ان کی پیش قدمی کو روک دیا۔
۱۱۔ معرکۂ سوئز (رمضان ۱۳۹۳ھ) جب کہ مصری فوجوں نے اسرائیلی فوجوں کو شکست دے کر نہر سوئز پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

اس قسم کے تاریخی واقعات بتاتے ہیں کہ روزہ اور جدوجہد حیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ روزہ کی مشقت آدمی کو کمزور نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس کو اس قابل بناتی ہے کہ زندگی کے معرکہ میں وہ زیادہ قوت اور طاقت کے ساتھ حصہ لے سکے۔

واحد راستہ

سفرنامہ (الرسالہ مارچ ۱۹۸۸) میں ایک جاپانی انجینیر شوگو کٹاکورا (Shogo Katakura) کا ذکر آیا ہے جن سے میری ملاقات مالدیپ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے میرے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ جاپان کے جغرافی حالات نے جاپانیوں کے اندر یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ وہ ہمیشہ نئے خیالات (New ideas) کی تلاش میں رہیں۔ وہاں بار بار موسم بدلتے ہیں، زلزلے اور طوفان سے بار بار نئے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے جاپانیوں کو بار بار یہ سوچنا پڑتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ کیا کریں۔

اس صورت حال نے نئے خیالات کی تلاش کو جاپانیوں کا مستقل مزاج بنا دیا ہے۔ یہی مزاج ہے جو دوسری جنگ عظیم کی بربادی کے بعد جاپانیوں کے کام آیا۔ انھوں نے جنگ کے بعد بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں اپنے معاملہ پر از سرِ نو غور کیا۔ اور نئے حالات کے مطابق نیا منصوبہ بنا کر دوبارہ زیادہ بڑی کامیابی حاصل کی۔ جاپانیوں کی اسی خصوصیت کو ایک امریکی مصنف نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے کہ وہ تبدیلی کے آقا بن گئے، بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکار ہو جائیں :

They became the masters of change
rather than the victims.

زندگی کا سفر کبھی ہموار راستہ پر طے نہیں ہوتا۔ زندگی حادثات اور مشکلات سے بھری ہوئی ہے۔ یہ حادثے اور مشکلیں افراد کو بھی پیش آتے ہیں اور قوموں کو بھی۔ یہ خود خالق کا قائم کیا ہوا نظام ہے، اس سے بچنا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے کامیابی کا راستہ صرف ایک ہے۔ وہ مشکلات کے باوجود اپنے سفر کو جاری رکھے۔ وہ راستہ کے کانٹوں اور پتھروں کے باوجود منزل تک پہونچنے کا حوصلہ کر سکے۔

حالات کی تبدیلی کے بعد حالات کے خلاف شکایت نہ کیجیے، بلکہ نئے حالات کے مطابق اس کا نیا حل سوچیے، اور آپ ہمیشہ کامیاب رہیں گے۔

Ticket to Success

No matter what their route, young Asian Americans, largely those with Chinese, Korean and Indochinese backgrounds, are setting the educational pace for the rest of America and cutting a dazzling figure at the country's finest schools.

Trying to explain why so many Asian-American students are superachievers, Harvard Psychology Professor Jerome Kagan comes up with this simple answer: "To put it plainly, they work harder." Even with the problems (o. restriction and discrimination), many Asian-American students are making the U.S. education system work better for them than it has for any other immigrant group since the arrival of East European jews began in the 1880s. Like the Asians, the Jews viewed education as the ticket to success. Both groups "feel an obligation to excel intellectually," says New York University Mathematician Sylvain Cappell, who as a Jewish immigrant feels a kinship with his Asian-American students. The two groups share a powerful belief in the value of hard work and a zealous regard for the role of the family. Such achievements are reflected in the nation's best universities, where math, science and engineering departments have taken on a decidedly Asian character. At the University of Washington, 20% of all engineering students are of Asian descent, at Berkeley the figure is 40%. To win these places Asian-American students make the SAT seem as easy as taking a driving test. The average math score of Asian-American high school seniors in 1985 was 518 (of a possible 800), 43 points higher than the general average.

A telling measure of parental attention is homework. A 1984 study of San Francisco-area schools by Stanford Sociologist Sanford Dornbusch found that Asian-American students put in an average of eleven hours a week, compared with seven hours by other students. Some Asian Americans may be pushing their children too hard. Says a Chinese-American high schooler in New York City: "When you get an 80, they say, 'Why not an 85?' If you get an 85, it's 'Why not a 90?' "Years ago," complains Virginia Kee, a high school teacher in New York's Chinatown, "they used to think you were Fu Manchu or Charlie Chan. Then they thought you must own a laundry or restaurant. Now they think all we know howto do is sit in front of a computer." The image of Asian Americans is as relentless book-worms. "If you are weak in math or science and find yourself assigned to a class with a majority of Asian kids, the only thing to do is transfer to a different section," says a white Yale sophomore.

The performance of Asian Americans also triggers resentment and tension, "Anti-Asian activity in the form of violence, vandalism, harassment and intimidation continues to occur across the nation," the U.S. Civil Rights Commission declared last year. Young immigrant Asians complain that they are constantly threatened. To some Asian Americans being only "very good" is tantamount to failure. "It seems to me that having people like this renews our own striving for excellence," observes Emmy Werner, professor of human development at the University of California at Davis. "We shouldn't be threatened but challenged." Mathematician Cappell is thrilled by the new inheritors. "Their presence," he says, "is going to be a great blessing for society."

نمونہ کی اقلیت

ایشیائی ملکوں کے جو لوگ امریکہ میں ہیں ان کو ایشیائی امریکی (Asian Americans) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ ۱۹۶۵ سے آکر یہاں آباد ہونا شروع ہوئے۔ وہ زیادہ تر چین، کوریا، انڈوچائنا وغیرہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جب یہاں آئے تو ان کا حال یہ تھا کہ ان میں سے بہت سے لوگ انگریزی میں معمولی گفت گو بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آج وہ ریڈرس ڈائجسٹ کی رپورٹ کے مطابق، امریکہ کے بہترین انگلش اسکولوں میں اعلیٰ ترین طالب علم (Superstudents) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی تعداد اگرچہ مجموعی آبادی میں صرف ۲ فی صد ہے، مگر مختلف امریکی اداروں میں انھوں نے ۲۰ فی صد تک جگہ لینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وہ ہر جگہ زیادہ لائق (Overqualified) ثابت ہو رہے ہیں۔

اس صورت حال نے امریکی دماغوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اس پر باقاعدہ ریسرچ کی گئی۔ اس ریسرچ کی رپورٹ مختلف امریکی اور غیر امریکی جرائد میں شائع ہوئی ہے۔ چند حوالے یہ ہیں:

1. *New York Times*, New York, August 3, 1986
2. Why Asian Americans are doing so well
   Time Magazine, New York, August 31, 1987
3. Why Asian American students excel
   Reader's Digest, August 1987
4. Why Asians succeed in America
   Span monthly, December 1987
5. Among the top 6 science students of the United States
   The Hindustan Times, New Delhi, August 30, 1987.

عام امریکی نوجوانوں کے مقابلہ میں ایشیائی امریکی تعلیم کے ہر شعبہ میں آگے کیوں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی کوشش کی مقدار امریکی نوجوانوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیروم کاگن سے پوچھا گیا کہ کیا سبب ہے کہ ایشیائی امریکی طلبہ اصل امریکی طلبہ کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہیں۔ ٹائم کی رپورٹ کے مطابق، انھوں نے کہا کہ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ وہ زیادہ محنت کرتے ہیں:

To put it plainly, they work harder.

یہ لوگ تعلیم کو اپنے لیے کامیابی کا ٹکٹ (Ticket to success) سمجھتے ہیں۔ اور واقعی امریکہ کا تعلیمی نظام ان کے لیے کامیابی کا یقینی ٹکٹ ثابت ہوا ہے۔ اس ٹکٹ کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے جو قیمت ادا کی ہے وہ ایک لفظ میں امتیاز (Excellence) ہے۔

اپنے اس عمل سے انھوں نے امریکہ میں نمونہ کی اقلیت (Model minority) کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ تاہم امریکہ میں ان کے لیے راستہ بالکل کھلا ہوا نہیں تھا۔ ان کو نسلی امتیاز اور حقارت آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ امریکی نوجوان ان کا مذاق اڑاتے اور ان کو زرد خطرہ (Yellow peril) کہتے۔ حتی کہ جسمانی طور پر مارنے پیٹنے کے واقعات بھی ہوتے رہے۔ مگر ایشیائی امریکیوں نے اس کے مقابلہ میں کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ شکایت اور احتجاج کے طریقہ سے مکمل پرہیز کرتے رہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ انھوں نے اپنی محنت کی مقدار بڑھا دی۔ ان کے والدین نے ان کے جذبات کو جوابی اشتعال سے بچایا اور اس کو جوابی محنت کے رخ پر ڈال دیا۔ ایشیائی خاندانوں میں تعلیم ایک قسم کا کابوس (Obsession) بن کر چھا گئی۔ ایشیائی امریکیوں کے گھروں کی فضا یہ ہو گئی کہ اگر ان کا لڑکا ۸۰ فی صد نمبر لائے تو وہ کہیں گے کہ ۸۵ فی صد کیوں نہیں۔ اور اگر لڑکا ۸۵ فی صد نمبر لائے تو اس کا باپ کہے گا کہ تم ۹۰ فی صد بھی تو لا سکتے تھے۔

کسی گروہ کو مسائل کا سامنا ہو تو اس کے لیے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا نمونہ ہم کو ہندستان میں نظر آتا ہے۔ یعنی مطالبہ اور احتجاج۔ اس طریق کار پر چلنے میں بیک وقت دو نقصانات ہیں۔ ایک یہ کہ اصل مسئلہ حل ہونے کے بجائے اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز عمل کے ذریعہ ملتی ہے نہ کہ مطالبہ کے ذریعہ۔ اور جو چیز عمل کے ذریعہ ملتی ہو اس کو مطالبہ کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا اس کو دور سے دور تر کر دینا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایسا گروہ دوسروں کی نظر میں بے عزت ہو جاتا ہے۔ مطالبہ اور احتجاج کا مطلب اپنے مسائل کا بوجھ دوسروں کے اوپر ڈالنا ہے، اور کون ہے جو اپنے مسائل کا بوجھ دوسروں کے اوپر ڈالنے کے بعد دوسروں کی نظر میں حقیر اور بے عزت نہ ہو جائے۔

اس کے برعکس مثال امریکہ کے ایشیائی امریکی گروہ کی ہے۔ انھوں نے اپنے مسئلہ کا حل یہ دریافت کیا کہ وہ اس کی ساری ذمہ داری خود قبول کریں۔ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ اور آخری حد تک پر امن رہتے ہوئے دوسروں سے زیادہ محنت کریں۔ ان کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس طرح عمل کرنے کے نتیجہ میں ان کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو گیا، بلکہ انھوں نے اپنے عددی تناسب سے زیادہ بڑا حصہ اپنے لیے پالیا۔

منفی رویہ اختیار کرنا گویا اپنے مسئلہ کا بوجھ دوسرے کے سر پر ڈالنا ہے، اور مثبت رویہ کا مطلب اپنے مسئلہ کی ذمہ داری خود قبول کرنا۔ اس لیے مثبت رویہ اختیار کرنے کا مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ سماج میں کوئی پیچیدگی پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتے۔ چنانچہ ایشیائی امریکیوں نے جب مثبت انداز سے اپنے مسئلہ کو حل کرنے کی راہ نکالی تو وہ امریکی سماج میں مزید فائدوں کو ظہور میں لانے کا ذریعہ بن گئے۔

اول یہ کہ انھوں نے امریکی نوجوانوں کے درمیان مقابلہ و مسابقت کی فضا پیدا کی۔ وہ امریکی نوجوان جو اپنے کو محفوظ سمجھ کر محنت میں کمی کرنے لگے تھے، ان کے اندر یہ جذبہ ابھر آیا کہ اگر انھیں زندہ رہنا ہے اور ترقی کرنا ہے تو ان کو بھی ایشیائیوں کی طرح زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔

ٹائم کی رپورٹ کے مطابق، خود امریکی دانشوروں کو اعتراف کرنا پڑا کہ ایشیائی امریکیوں نے ہمارے نوجوانوں کی سستی کو ختم کرکے ان کو ازسرِ نو چست بنا دیا ہے۔ ہمارے سماج میں ان کی موجودگی ہمارے لیے ایک عظیم رحمت ہے:

Their presence is going to be a great
blessing for society (p. 53).

اسپان (دسمبر ۱۹۸۷) کی رپورٹ کے مطابق، نیویارک کے ایک درمیانی عمر کے آدمی نے کہا کہ ایشیائی امریکیوں کے لیے خدا کا شکریہ، وہ ہمارے اسکولوں میں دوبارہ معیار کو واپس لا رہے ہیں:

Thank God for the Asians. They're bringing back
standards to our schools (p. 32).

۲۔ ایشیائی امریکی گروہ کو دوسرا فائدہ یہ ملا کہ جب انھوں نے معاشی عزت حاصل کی تو ان کی تہذیب بھی لوگوں کی نظر میں باعزت بن گئی۔ ان کی قومی روایات امریکیوں کی نظر میں محترم بن گئیں۔ یہ ایشیائی امریکی لوگ کنفیوشس کو اپنا مذہبی پیشوا مانتے ہیں۔ جب ایشیائی امریکیوں کی ایک قابل تعریف خصوصیت امریکہ والوں کے سامنے آئی تو انھوں نے ان کی اس خصوصیت کو ان کے قومی بزرگ (کنفیوشس) سے جوڑ دیا۔ ایشیائی امریکیوں کے ممتاز عمل نے امریکیوں کی نظر میں ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو قابل توجہ بنا دیا۔ اسپان کی رپورٹ کے مطابق، نیویارک یونیورسٹی کے پریسیڈنٹ نے کہا کہ جب میں اپنے ایشیائی طلبہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ ان کی کامیابی زیادہ تر کنفیوشس کی تعلیمات کا نتیجہ ہے:

When I look at our Asian-American students, I am certain that much of their success is due to Confucianism (p. 32).

ایشیائی مہاجرین کا مقابلہ جہاں عام امریکیوں سے پیش آتا ہے، وہ ان کے مقابلہ میں زیادہ لائق (Overqualified) ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ عام امریکیوں کے لیے ایک مہمیز یا چیلنج بن گئے ہیں۔ وہ امریکی نوجوانوں میں محنت کا نیا جذبہ ابھارنے کا ذریعہ ثابت ہو رہے ہیں۔ ایشیائی مہاجرین نے مثبت طور پر اپنا ذاتی مسئلہ حل کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی سماج کا اپنا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

ایشیائی مہاجرین نے امریکہ میں صرف ایک نسل کے اندر وہ کامیابی حاصل کی ہے جس کو عام طور پر لوگ تین نسلوں میں حاصل کرتے ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی نے امریکہ میں ایک نئی اصطلاح پیدا کی ہے جس کو ایشیائی اخلاقیاتِ عمل (Asian work ethics) کہا جاتا ہے۔ اب وہاں کہا جانے لگا ہے کہ اگر اعلیٰ ترقی حاصل کرنا ہے تو ایشیائی اخلاقیاتِ عمل کو اختیار کرو۔

یہی دروازہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے بھی زیادہ بڑے پیمانے پر کھلا ہوا ہے۔ مسلمان اگر ان قومی جھگڑوں کو چھوڑ دیں جن میں ان کے سطحی لیڈروں نے انھیں بے فائدہ طور پر الجھا رکھا ہے، اور وہ اسلام کے دیئے ہوئے ابدی اصولوں پر اپنی زندگی کی مثبت تعمیر شروع کر دیں تو

اس ملک میں وہ ایک نئے انقلاب کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس طرح مسلمان نہ صرف اپنا مسئلہ حل کریں گے بلکہ وہ اس ملک کو ایک نیا معیار دیں گے جس کو ایک لفظ میں (Muslim work ethics) (مسلم اخلاقیات عمل) کہا جا سکتا ہے۔ اور جب ایسا ہوگا تو مسلمان اس ملک میں سرمایہ (Asset) بن جائیں گے جو کہ اس وقت ملک کے لیے صرف ایک بوجھ (Liability) بنے ہوئے ہیں۔

ہندستان کے مسلمان ابھی تک تہذیبی تشخص (Cultural identity) حاصل کرنے کے لیے مطالباتی تحریکیں چلانے میں مشغول رہے ہیں۔ میرے نزدیک اس قسم کی تمام کوششیں سراسر بے فائدہ ہیں۔ کیوں کہ تہذیبی تشخص اپنی داخلی قوت سے قائم ہوتا ہے، وہ مطالبہ کر کے حاصل نہیں کیا جاتا۔

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مسلمان اخلاقی تشخص کو اپنا نشانہ بنائیں۔ وہ اسلامی اخلاق اختیار کرنے کو اپنے نشان امتیاز قرار دیں۔ مسلمان اگر اخلاقی حیثیت سے اپنا تشخص قائم کر سکیں تو وہ تہذیبی حیثیت سے بھی اپنے آپ اپنا تشخص پالیں گے جس کے لیے وہ بے فائدہ طور پر مطالباتی مہم چلانے میں مشغول ہیں۔

فکری طاقت

قرآن میں آئندہ آنے والے زمانہ کے بارہ میں جو خبریں دی گئی ہیں ان میں سے ایک پیشگی خبر وہ ہے جو سورہ نمبر ۴۱ میں ان الفاظ میں آئی ہے :

سنریهم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق۔ اولم یکف بربك انه علی کل شئ شهید۔ (حم السجدۃ ۵۳)

عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں اور انفس میں، یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ حق ہے۔ کیا یہ تیرے رب کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

اس آیت کے مطابق، نزول قرآن کے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جب کہ فطرت کی نشانیوں کا ظہور ہی تبیینِ حق کے لیے کافی ہو جائے۔ جب کہ کائنات اور انسان کے بارہ میں علمی انکشافات ہی ان حقائق کو ثابت شدہ بنا دیں جن کی خبر قرآن اور صاحب قرآن (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ اہلِ عالم کو دی گئی ہے۔

یہی بات حدیث میں ایک اور انداز سے آئی ہے۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں صحیح مسلم کی ایک روایت نقل کرتے ہیں :

عن ابی هریرة رض، ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: "هل سمعتم بمدینة، جانب منها فی البر وجانب منها فی البحر، قالوا: نعم یارسول الله، قال: "لاتقوم الساعة حتی یغزوها سبعون الفاً من بنی اسحاق، فاذا جاؤوها نزلوا، فلم یقاتلوا بسلاح ولم یرموا بسهم، قالوا: لا اله الا الله والله اکبر، فیسقط احد جانبیها. قال ثور بن زید الراوی: لا اعلمه الا قال: "الذی فی البحر، ثم یقولون الثانیة، لا اله الا الله، والله اکبر، فیسقط جانبها الآخر، ثم یقولون الثالثة، لا اله الا الله، والله اکبر، فیفرج لهم فیدخلونها فیغنمون، فبیناهم یقتسمون المغانم اذجاء هم الصریخ، فقال: ان الدجال قد خرج، فیترکون کل شئ ویرجعون" رواه مسلم۔

حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم نے ایک شہر کے بارہ میں سنا ہے

جس کا ایک رُخ خشکی کی طرف ہے اور اس کا دوسرا رخ سمندر کی طرف ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں اے خدا کے رسول۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک بنو اسحاق کے ستر ہزار افراد اس سے جنگ نہ کریں۔ جب وہ لوگ اس شہر تک آئیں گے تو وہ وہاں اتریں گے۔ وہ کسی ہتھیار سے نہ لڑیں گے اور نہ کوئی تیر ماریں گے۔ وہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ پس اس کے دو رخوں میں سے ایک رُخ گر جائے گا۔ ثور بن زید (راوی حدیث) نے کہا کہ میں اس کے سوا نہیں جانتا کہ آپ نے فرمایا کہ وہ جو سمندر کی جانب ہے۔ پھر وہ لوگ دوبارہ کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، پس اس کا دوسرا رُخ گر جائے گا۔ پھر وہ لوگ تیسری بار کہیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے، پس وہ ان کے لیے کھل جائے گا وہ اس میں داخل ہو جائیں گے اور غنیمت حاصل کریں گے۔ پس جب وہ غنیمت تقسیم کر رہے ہوں گے، اسی اثنار میں پکار سنائی دے گی۔ کہنے والا کہے گا کہ دجال نکل آیا۔ پس وہ ہر چیز چھوڑ دیں گے اور لوٹ آئیں گے۔

اس روایت کی ذیلی تفصیلات سے ہٹ کر اس کے اصل مدعا کو دیکھیے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آئندہ ایسا زمانہ آئے گا جب لاالٰہ الا اللہ، اللہ اکبر کہہ دینے سے فتح حاصل ہوگی۔ بالفاظ دیگر، ہتھیار کو استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ بلکہ اسلام کی فکری اور نظریاتی طاقت ہی قوموں کو مسخر کرنے کے لیے کافی ہو جائے گی۔

مذکورہ حدیث میں آخری زمانہ کے ایک واقعہ کا ذکر ہے جس کے لیے حدیث میں "غزوہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوہ کی تشریح فرمائی تو کہا کہ وہ نہ کسی ہتھیار سے لڑیں گے اور نہ کوئی تیر چلائیں گے۔ وہ صرف لاالٰہ الا اللہ کہیں گے اور ان کے لیے فتح کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ "غزوہ" کا مطلب لازمی طور پر جنگ و قتال نہیں ہے۔ فکری اور نظریاتی مہم بھی اسلام کے نزدیک غزوہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق، دور آخر میں غزوہ کی یہی قسم مسلمانوں کے لیے غلبہ اور کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگی۔

ردعمل

سعید نورسی (۱۹۶۰-۱۸۷۳ء) ترکی کے ایک عالم اور مجاہد تھے۔ وہ بے حد ذہین اور قابل آدمی تھے۔ ترک حکومت کے خلاف ان کے پرجوش بیانات کی وجہ سے حکومت ان کی مخالف ہوگئی۔ وہ گرفتار کر لیے گئے۔ وہ فوجی عدالت کے سامنے پیش کیے گئے۔ وہاں انھوں نے بیان دیتے ہوئے کہا:

لو ان لی الف روح لما ترددت ان اجعلها فداء لحقیقة واحدة من حقائق الاسلام۔

اگر میرے پاس ایک ہزار روح ہوتی تب بھی میں اس سے نہ ہچکچاتا کہ ان سب کو اسلام کی حقیقتوں میں سے کسی ایک حقیقت کے لیے قربان کردوں۔

(دعوة الحق، رباط، نومبر ۱۹۸۵، صفحہ ۸۰)

سعید نورسی تعلیم اور مطالعہ میں مشغول تھے کہ ایک واقعہ گزرا جس نے ان کی زندگی کو مجاہدانہ زندگی بنا دیا:

وفی هذه الاثناء قرأ بدیع الزمان فی الجرائد المحلیة ان وزیر المستعمرات البریطانی غلادستون صرح فی مجلس العموم البریطانی وهو یخاطب النواب و بیده نسخة من القرآن الکریم قائلاً: مادام هذا القرآن بید المسلمین فلن نستطیع ان نحکمهم۔ لذلك فلا مناص لنا من ان نزیله من الوجود او نقطع صلة المسلمین به۔

(۱۸۹۴ کے دوران) بدیع الزمان سعید النورسی نے بعض مقامی اخبارات میں پڑھا کہ برطانیہ کے وزیر نوآبادیات گلیڈسٹون نے برطانی دارالعوام میں تقریر کی۔ ان کے ہاتھ میں قرآن تھا اور انھوں نے نمائندگان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے گا ہم ان کے اوپر اپنا حکم نہیں چلا سکتے۔ اس بنا پر ہمارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ یا تو اس کتاب کا وجود مٹا دیں یا مسلمانوں کا رشتہ اس سے کاٹ دیں۔

(صفحہ ۸۷)

سعید نورسی کے اندر یہ تڑپ نہیں اٹھی کہ وہ "گلیڈاسٹون" کو گمراہی سے نکالیں اور

اس کو جنت کا راستہ دکھانے کی کوشش کریں۔ البتہ اس نے سعید نورسی کی مقدس کتاب کی توہین کردی تو وہ بھڑک اٹھے۔ یہی موجودہ زمانہ میں تمام مسلم شخصیتوں کا حال رہا ہے۔ مثبت مقصد کے لیے وہ نہ اٹھ سکے۔ البتہ ردعمل کے جذبہ کے تحت وہ کبھی ایک کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑے ہو گیے اور کبھی دوسرے کے خلاف۔

اسلام مثبت حقیقتوں کا دین ہے۔ وہ ردعمل کے تحت بھڑک اٹھنے کا نام نہیں۔ مومن وہ ہے جو خدا کی عظمتوں کو دریافت کرے اور اس میں جینے والا بن جائے۔ وہ کائنات میں خدا کی نشانیوں کو پڑھے اور اس کے ذہن میں ربانی علوم کا چشمہ پھوٹ نکلے۔ وہ غیب کے پردہ کو پھاڑ کر جنّت اور جہنّم کو دیکھ لے اور پھر شدید ترین طور پر اس بات کا حریص بن جائے کہ خدا اس کو جہنّم کی آگ سے بچائے اور اس کو جنّت کے باغوں میں داخل کرے۔

اسی معرفت کا نام ایمان و اسلام ہے۔ اور یہ ایمان و اسلام اپنی آخری انتہا پر پہونچ کر دعوت بن جاتا ہے۔

سعید نورسی نے پرجوش طور پر کہا تھا کہ اسلام کی باتوں میں سے کسی ایک بات کا مسئلہ بھی ہو تو وہ اس کے لیے اپنا پورا وجود صرف کرنے کے لیے تیار ہیں۔ بظاہر ان کے یہ الفاظ تمام اسلام کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو اس کا تعلق صرف جزئی اسلام سے ہے نہ کہ کلّی اسلام سے۔

ایک غیر مسلم شخص کا قرآن کے خلاف گستاخی کرنا اسلام کے مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے اسی طرح اسلام کا ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ اس غیر مسلم کو اور اس کے جیسے دوسرے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت پہونچائی جائے۔ سعید نورسی اور ان کے جیسے دوسرے لوگ اولی الذکر اسلامی مسئلہ کے لیے تو بہت تڑپے۔ مگر ثانی الذکر اسلامی مسئلہ کے لیے ان میں سے کسی کے اندر تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام مسلم مجاہدین کا معاملہ ہے۔ وہ دوسروں سے نفرت کرنے کے مجاہد بنے، مگر وہ دوسروں سے محبت کرنے کے مجاہد نہ بن سکے۔ لوگوں کو جہنّم میں داخل کرنے کے لیے انھوں نے بہت سرگرمی دکھائی، مگر وہ اس کے لیے سرگرم نہ ہو سکے کہ لوگوں کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں پہونچائیں۔

اختلافِ امّت

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہود ۷۱ فرقوں میں بٹ گیے۔ اور نصاریٰ ۷۲ فرقوں میں بٹ گیے۔ اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی (افترقت الیہود علی احدی وسبعین فرقۃ وافترقت النصاریٰ علی اثنتین وسبعین فرقۃ۔ و ستفترق امتی علیٰ ثلاث وسبعین فرقۃ)

علمار سنت نے اس حدیث کی صحت پر کلام کیا ہے۔ تاہم، جیسا کہ المقبلی نے اپنی کتاب العلم الشامخ میں لکھا ہے، اس بارے میں کثیر روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں جو ایک دوسرے کو مضبوط کرتی ہیں، اس لیے اس کے اصل مفہوم میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا (حدیث افتراق الامۃ الیٰ ثلاث وسبعین فرقۃ روایاتہ کثیرۃ یشد بعضھا بعضاً بحیث لاتبقی ریبۃ فی حاصل معناہ)

اکثر لوگوں نے ۷۳ کی تعداد کو حسابی گنتی کے معنی میں لیا ہے، چنانچہ انھوں نے مسلم فرقوں کی فہرست بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ابن حزم شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں ان کی تعداد ۷۶ بتائی ہے۔ الاشعری نے مقالات الاسلامیین میں ان کی تعداد ایک سو سے زیادہ تک شمار کی ہے۔ الخوارزمی کے نزدیک ان فرقوں کی تعداد ۷۲ ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دکتور محمد عمارۃ کی کتاب الخلافۃ ونشأۃ الاحزاب الاسلامیۃ) مگر حقیقت یہ ہے کہ حدیث میں ۷۳ کا لفظ تعداد کی کثرت بتانے کے لیے آیا ہے نہ کہ تعداد کی حد بتانے کے لیے۔ اس لیے ہمیں تعداد کا شمار کرنے کے بجائے اختلاف کی اصل حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔

صحابہ کی رائے

ان مسألۃ الخلاف بین المسلمین ارقت امیر المومنین عمر بن الخطاب فی لحظۃ تامل وتفکر، فظل یسأل نفسہ: کیف تختلف ھذہ الامۃ ونبیھا واحد؟ ثم اعاد طرح السوال علیٰ عبد اللہ بن عباس، فیما تشیر الروایۃ، وقال لہ: کیف تختلف ھذہ الامۃ ونبیھا واحد، وقبلتھا واحدۃ، وکتابھا واحد۔

رد ابن عباس قائلا، یا امیر المومنین انما انزل علینا القرآن فقرأناه وعلمنا فیما انزل، وانه سیکون بعدنا اقوام یقرأون القرآن ولا یدرون فیما نزل، فیکون لکل قوم رأی. فاذا کان لکل قوم فیہ رای لاختلفوا فاذا اختلفوا اقتتلوا۔ تقول الروایة ان سیدنا عمر زجر ابن عباس و نھرہ سیدنا علی: فانصرف ابن عباس ونظر عمر فیما قال فعرفہ .... فارسل الیہ وقال: اعد علی ما قلتہ فاعاد علیہ فعرف عمر قولہ واعجبہ (د۔ یوسف القرضاوی) ۔ العمدۃ الاسلامیۃ ص ۸۹ نقلاً عن مصادر اخری)

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے معاملہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فکر میں مبتلا کر دیا۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتے رہتے کہ یہ امت کیوں کر مختلف اور متفرق ہو جائے گی جب کہ اس کا پیغمبر ایک ہے جیسا کہ روایات بتاتی ہیں، انھوں نے اس سوال کو عبداللہ بن عباس کے سامنے رکھا اور ان سے کہا کہ یہ امت کیسے مختلف ہو جائے گی جب کہ اس کا پیغمبر ایک ہے اور اس کا قبلہ ایک ہے اور اس کی کتاب ایک ہے۔ عبداللہ بن عباس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اے امیر المومنین ہمارے اوپر قرآن اترا، پھر ہم نے اس کو پڑھا اور یہ جانا کہ وہ کس بارہ میں اترا ہے۔ اور ہمارے بعد ایسے لوگ ہوں گے جو قرآن کو پڑھیں گے مگر وہ نہیں جانیں گے وہ کس بارہ میں اترا ہے۔ چنانچہ ہر ایک کی الگ الگ رائے ہو جائے گی، اور جب ہر ایک کی الگ رائے ہوگی تو وہ اختلاف کریں گے اور جب اختلاف کریں گے تو آپس میں لڑیں گے۔ روایت کہتی ہے کہ حضرت عمر نے عبداللہ بن عباس کو جھڑک دیا اور حضرت علیؓ نے بھی ان کو ڈانٹا۔ وہ واپس چلے گیے۔ پھر حضرت عمرؓ نے ان کے قول پر غور کیا تو وہ سمجھ گیے۔ حضرت عمر نے دوبارہ انھیں بلایا اور کہا کہ اپنے قول کو دہراؤ۔ انھوں نے دہرایا۔ حضرت عمر ان کے قول کو سمجھ گیے اور اس کو پسند کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے جو بات کہی اور حضرت عمر نے جس کی تصدیق فرمائی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو پڑھنے کے دو درجے ہیں۔ ایک ہے معرفت کے ساتھ پڑھنا، اور دوسرا ہے معرفت کے بغیر پڑھنا۔ جو شخص معرفت کی سطح پر قرآن کو پڑھے، وہی قرآن کو حقیقی طور پر سمجھے گا، اور جو شخص معرفت کے بغیر قرآن کو پڑھے وہ پڑھنے کے باوجود قرآن کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

اصل دین

ایک صاحب نے پرجوش طور پر لکھا ہے کہ "توحید صرف ذاتی عقیدہ یا انفرادی عبادت کا نام نہیں۔ اس سے بڑھ کر توحید یہ ہے کہ اللہ کی حکمرانی کو تمام انسانوں کے اوپر قائم کیا جائے۔ اللہ کے سیاسی اور اجتماعی قوانین کو سارے عالم میں غالب اور نافذ بنا دیا جائے"

بظاہر یہ ایک بے ضرر کلام معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بالکل لغو کلام ہے۔ وہ تحریفِ دین کی حد تک قابلِ اعتراض ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے عقیدہ کو محض اقرار اور عبادت کو صرف مراسم پرستش کی ادائیگی کے ہم معنی سمجھا ہے۔ حالاں کہ یہ عقیدہ اور عبادت کی تصغیر ہے۔

عقیدہ سے مراد صرف تلفظ کلمہ یا اقرار لسانی نہیں ہے۔ عقیدہ ایک شعوری سفر کی منزل یا ایک ذہنی انقلاب کی تکمیل ہے۔ عقیدہ ایک عظیم ترین روحانی تجربہ ہے یہ اس ناقابلِ بیان ربانی حالت کا نام ہے جب کہ ایک بندہ حقیقتِ اعلیٰ کے سمندر میں نہاتا ہے، جب وہ ایک ابدی نور سے روشن ہو کر چمک اٹھتا ہے۔

اسی طرح عبادت کو صرف کچھ ظاہری مراسم کی ادائیگی کے ہم معنی سمجھنا، عبادت سے سراسر ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ عبادت اس کائنات کا عظیم ترین واقعہ ہے۔ عبادت اس لرزہ خیز لمحہ کا نام ہے جب کہ عاجز مطلق قادر مطلق سے ملاقات کرتا ہے۔ جب کہ ایک بااختیار انسان خود اپنے ارادہ سے اپنے کو بے اختیار بنا لیتا ہے۔ جب وہ حقیقتِ واقعہ کا آزادانہ اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہمہ تن اللہ کے آگے ڈال دیتا ہے۔ عبادت اس کائنات کے اس نادر ترین لمحہ کا نام ہے جب کہ ایک بندہ رب العالمین کے آگے ڈھ پڑتا ہے حالاں کہ وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور نہ تھا۔

عقیدہ اور عبادت دینِ خداوندی کا جزء نہیں، وہ دینِ خداوندی کی اصل ہیں۔ جہاں یہ اصل موجود ہو وہاں لازماً دوسری تمام مطلوب چیزیں بھی موجود ہوں گی۔ جہاں یہ اصل نہیں وہاں بقیہ چیزوں میں سے کوئی چیز بھی پائی نہیں جا سکتی۔

ایک نظریہ

جدید ذہن پر جن چند لوگوں نے بہت زیادہ اثرات ڈالے ہیں ان میں سے ایک ممتاز نام سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) کا ہے۔ وہ تحلیل نفسی (Psychoanalysis) کا ماہر تھا۔ اپنے نفسیاتی مریضوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے انسان کے ذہنی ساپنچہ (Mental structure) کا ایک نقشہ بنایا۔ اس نے اس بات کی توجیہہ کی کہ آدمی کا لاشعور (Unconscious mind) کس طرح عمل کرتا ہے۔

فرائڈ نے کہا کہ انسان کا لاشعور ہی دراصل یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کیا کرے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کا نیت اور ارادہ ہر قسم کے جرم کی ذمہ داری سے بری ہو گیا۔ جب آدمی کا عمل اس کے شعور اور ارادہ سے صادر نہیں ہوتا بلکہ اس کے لاشعور یا اس کے غیر شعوری ذہن کے تحت صادر ہوتا ہے تو انسان باعتبار حقیقت ارادی مجرم نہ رہا۔ ایک مبصر نے لکھا ہے :

> Perhaps no science has been a more powerful source of forgiveness than the psychoanalysis of Freud. The sinner becomes a patient. And if he seems to do wrong, it is not really he who does it but an unconscious whose machinations are unknown to him. (*Times*, London)

غالباً کوئی اور علم نہیں جس نے فرائڈ کی تحلیل نفسی سے زیادہ انسان کی بے گناہی ثابت کرنے کا کام کیا ہو۔ اس نظریہ کے مطابق گناہ گار ایک مریض کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اور اگر وہ غلطی کرتا ہوا نظر آئے تو حقیقۃً وہ خود نہیں ہے جو ایسا کر رہا ہے بلکہ ایک لاشعور ہے جس کا نظام اس کے اپنے لیے بھی غیر معلوم ہے۔

فرائڈ کے اس نظریہ کے مطابق انسانوں میں جو تقسیم ہے وہ صحیح اور غلط (Right and wrong) کی نہیں ہے بلکہ صحیح اور ذہنی اعتبار سے غیر صحت مند (Right and not mentally healthy) کی ہے۔ جس چیز کو پہلے نظم کہا جاتا تھا وہ اب غیر صحت مند دباؤ ہے :

What was once discipline is now unhealthy repression

مگر انسانی فطرت کے بارہ میں جدید ترین تحقیقات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

بدتر از گناہ

ٹائمس آف انڈیا (۱۵ ستمبر ۱۹۸۷) میں راقم الحروف کا ایک مضمون چھپا تھا۔ ایک بزرگ نے اس کو غلط شکل میں پیش کر کے مجھ کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ ان صاحب سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں تنبیہ کی۔ میں نے کہا کہ اگر بات کو غلط شکل میں پیش کر کے مطعون کرنا درست ہو تو اس طرح آپ کسی بھی شخص کو مطعون کر سکتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ صحیح کیوں نہ ہو۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ۱۳۲۲ھ میں ایک فتویٰ مرتب کیا۔ اس میں چار دیوبندی علماء (مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد سہارن پوری، مولانا اشرف علی تھانوی) کو کافر قرار دیا گیا تھا۔ تکفیر کا یہ فتویٰ بظاہر اتنا قطعی تھا کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی جب حجاز گیے اور مکہ اور مدینہ کے عرب علماء کو اسے دکھایا تو حرمین کے علماء نے بھی اس کو صحیح سمجھ کر اس کی تصدیق کر دی۔ اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے ہندستان واپس آکر اس کو "حسام الحرمین" کے نام سے شائع کر دیا۔ مگر تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ فتویٰ صحیح نہ تھا۔ کیونکہ اس میں مذکورہ علماء دیوبند کی عبارتوں کو غلط شکل میں پیش کیا گیا تھا۔

میری یہ بات سن کر مذکورہ بزرگ نے کہا کہ میں نے وہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی۔ فلاں صاحب نے آپ کے خلاف ایک مراسلہ چھپوایا تھا، اسی کو میں نے دہرا دیا۔ میں نے کہا کہ آپ کی اس توجیہ سے آپ کا جرم کم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ جو بات سنے اس کو بیان کرنے لگے (کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع) اگر آپ خود سے ایسی بات کہیں تو آپ مسخ حقیقت (Distortion of facts) کے مجرم ہیں اور اگر آپ اخباری خط کو پڑھ کر بلا تحقیق اس کو دہرائیں تو حدیث کے مطابق کذب بیانی کے مجرم۔ غلطی کو چھپانے کے لیے جھوٹی توجیہ کا سہارا لینا عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔

عبرت ناک

مریم جمیلہ ایک امریکی نومسلمہ ہیں۔ وہ آج کل پاکستان میں رہتی ہیں۔ انھوں نے اسلام کے بارے میں انگریزی میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام یہ ہے :

Islam in Theory and Practice

اس کتاب کا اردو ترجمہ "اسلام ایک نظریہ، ایک تحریک" کے نام سے پاکستان سے شائع ہوا ہے اس کتاب کا ایک باب "اسلام اور صفائی پسندی" کے بارے میں ہے۔ اس باب کے آغاز میں وہ لکھتی ہیں :

" آج مسلمان ممالک میں بے حد گندگی اور غلاظت پائی جاتی ہے۔ باہر سے آنے والے لوگ مسلمانوں سے جو نفرت کرتے ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ گندگی اور غلاظت بھی ہے۔ یہ چیز مسلمانوں کی ساری شہرت اور ساکھ پر پانی پھیر دیتی ہے۔ کسی بھی یوروپی سیاح سے پوچھئے۔ دنیائے اسلام کے ملکوں اور عوام کے متعلق اس کا کیا خیال ہے ؟ آپ کو ہمیشہ ایک جواب ملے گا : "وہ کتنے غلیظ ہیں !" افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ان کی یہ نکتہ چینی بسا اوقات اس قدر صحیح ہوتی ہے کہ خود یورپی نژاد نومسلم محض اسی وجہ سے ارتداد کے کنارے پہونچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میری ایک بہت اچھی دوست ایک جرمن نومسلم —— بیگم فاطمہ ہیرن سرکا ہیں۔ وہ اور ان کے شوہر اُن دنوں ایک مسلمان ملک میں اسلامی زندگی بسر کرنے کی انتہائی کوشش کر رہے تھے۔ ۱۱ اگست ۱۹۶۴ کو بیگم فاطمہ نے مجھے ایک خط میں لکھا :

" میرے شوہر اِس ملک میں پھیلی ہوئی گندگی سے بے حد متنفر ہو چکے ہیں۔ ان کے دفتر کی دیواریں خصوصاً سیڑھیاں پان کی پیک سے لال سیاہ ہو رہی ہیں۔ لوگ اپنی پتلون کے بٹن باتھ روم میں نہیں، اپنے میز کی طرف واپس آتے ہوئے لگاتے ہیں۔ جس ٹونٹی پر میرے شوہر نماز کے لیے وضو کرتے ہیں دوسرے لوگ وہاں اپنے مصنوعی دانت صاف کرنے بیٹھ جاتے ہیں اور پان کی سرخی سے ارد گرد کی ہر چیز کو لال کر دیتے ہیں۔ اسی دوران میں نوکر جا کر پینے کا پانی بھرتے رہتے ہیں۔ جمعہ کے روز نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر مسجد میں آنے

کے بجائے گندے اور بدبو دار کپڑوں میں جمع ہو جاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ پاکستان میں جس قسم کے حالات ہیں ان کے پیش نظر میرے شوہر کی رائے یہ ہے کہ ہمیں اپنے ایمان کی سلامتی مطلوب ہے تو جلد سے جلد مسلمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے ۔ جرمنی میں وہ اپنی تبلیغی جدوجہد کے لیے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوسکیں گے"

انھوں نے پاکستان کے مسلمان معاشرہ میں بود و باش اختیار کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے اور اگلے سال دونوں میاں بیوی اپنی آبائی سرزمین کو لوٹ گیے ۔ کس قدر اندوہناک بات ہے ۔ آج کے مسلمان ممالک اپنی گندگی کی وجہ سے دنیا بھر میں بدنام ہیں ۔ حالانکہ اسلام سے زیادہ کوئی دوسرا مذہب جسم اور ماحول کے پاک صاف ہونے کی ضرورت و اہمیت پر زور نہیں دیتا" (صفحہ ۸۴ - ۸۳)

پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں تقریباً نصف صدی سے "اسلامی نظام قائم کرو" کا غلغلہ مچا ہوا ہے ۔ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ آج ایک نومسلم اپنے اسلام کو بچانے کے لیے "اسلام پسندوں" کے ملک کو چھوڑ کر "کفر پسندوں" کے ملک میں پناہ لے رہا ہے ۔

اس صورت حال کی ذمہ داری تمام تر ان نام نہاد اسلامی قائدین پر ہے جنھوں نے دین میں "لازم" کو "متعدی" کرنے کا مجرمانہ فعل انجام دیا ۔ قرآن میں اَقِیمُوا الدِّینَ کا حکم اس معنی میں تھا کہ ہر مسلمان دین پر قائم ہو جائے ۔ مگر جھوٹی تعبیرات کے ذریعہ اس کا مفہوم یہ بنا دیا گیا کہ حکمرانوں کے اوپر دین کو قائم کرو ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر آدمی دوسروں کے خلاف دین کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے ، خود اپنی زندگی میں اس کو دین پر کاربند ہونے کی کوئی فکر نہیں ۔

اسی طرح تمام اسلامی احکام کو فعلِ لازم سے فعلِ متعدی کر دیا گیا ہے ۔ اس معنوی تحریف کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ حکمرانوں کے اوپر دین کو نافذ کرنے کے لیے تو قتال اور مسلح اقدام تک جانے کی تقریریں کر رہے ہیں ، اور خود اپنی زندگی میں معمولی اخلاقی آداب کا اہتمام کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے ۔

ایک آیت

سورہ لقمان کے آخر میں ارشاد ہوا ہے: بے شک قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، اور وہی بارش اتارتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے۔ اور کسی کو بھی علم نہیں کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا۔ اور کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔

جو لوگ قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قیامت کی ساری تفصیلات انسان کے علم میں نہیں۔ مگر زندگی کی بہت سی حقیقتیں ہیں جن کے وقت اور ان کی نوعیت کا کسی کو علم نہیں۔ ہم اپنی بشری محدودیت کی وجہ سے ان کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ پھر بھی کوئی شخص ان کا انکار نہیں کرتا۔ زندگی کے تمام معاملات اسی قسم کی "ناکافی" معلومات کی بنیاد پر چلائے جاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کی معلومات کو قیامت کے انکار کے لیے معقول وجہ مان لینا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

بارش آتی ہے اور آنے والی ہے، مگر انسان کو قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی آج بھی محکمہ موسمیات اس معاملہ میں اتنا ہی عاجز ہے جتنا قدیم دور کا انسان اپنے کو عاجز محسوس کرتا تھا۔

عورت حاملہ ہوتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ جننے والی ہے۔ مگر کیا جنے گی یہ کسی کو نہیں معلوم۔ پیدا ہونے والا کتنی مدت تک دنیا میں رہے گا اور کب مر جائے گا۔ وہ کیا کمائے گا۔ وہ برا نکلے گا یا بھلا۔ وہ دوسروں کو کیا دے گا اور خود کیا حاصل کرے گا۔ اندر کا انسان باہر آکر کیا ثابت ہوگا۔ یہ سب باتیں لامعلوم رہتی ہیں۔ پھر بھی انسان یقین رکھتا ہے کہ عورت کے پیٹ سے ایک جان ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ مذکورہ عدم واقفیت کو اس کے انکار کی وجہ نہیں بنا لیتا۔

کسی آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ وہ آئندہ کیا کچھ حاصل کرے گا۔ آدمی پروگرام بناتا ہے مگر اس کی تکمیل ہمیشہ غیر یقینی رہتی ہے۔ وہ بڑے بڑے منصوبے بناتا ہے۔ مگر اس کا منصوبہ بالآخر کیا صورت اختیار کرے گا، اس کو کوئی نہیں جانتا۔

موت ہر ایک کے لیے یقینی ہے۔ مگر کون شخص کہاں مرے گا اور کہاں اپنی کتاب زندگی کا آخری صفحہ لکھے گا، اس کے بارے میں کوئی بھی قطعی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

کب، کیا، کتنا اور کہاں کے سوالات جن کو لوگ قیامت کے انکار کے لیے بنیاد بناتے ہیں، ٹھیک نہیں سوالات کی موجودگی میں دوسری باتوں کو مان لیتے ہیں اور ان کی بنیاد پر اپنی زندگی کا نظام چلاتے ہیں۔ پھر اسی قسم کی کمتر واقفیت کی بنا پر قیامت کے بارے میں کیوں شبہ کیا جانے لگے۔

اور اللہ ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے (وَیَعلَمُ مَافِی الاَرحَام) اس آیت کی تفسیر عام طور پر یہ مشہور ہو گئی ہے کہ یہ خدا ہی کے علم میں ہے کہ حاملہ عورت کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی۔ مگر آیت کے الفاظ میں اس تفسیر کی کوئی بنیاد موجود نہیں۔ آیت کے الفاظ بالکل عام ہیں۔ "رحم کے اندر کیا ہے، یہ خدا ہی کو معلوم ہے"۔ ان الفاظ میں ہر وہ بات آسکتی ہے جو پیدا ہونے والے کی زندگی اور مستقبل سے متعلق ہو۔ یہاں ایسا کوئی بھی قرینہ موجود نہیں ہے جس کی بنا پر اس کو مذکر اور مؤنث کے ساتھ خاص کیا جائے۔

جہاں تک قرآن کی قدیم تفسیروں کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر دو باتیں کہی جاتی رہی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک تفسیر کا حوالہ نقل کرتے ہیں۔

(ویعلم ما فی الارحام) ای من ذکر او انثی شقی او سعید۔ صفوۃ التفاسیر، محمد علی الصابونی

خدا ہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے، یعنی مذکر یا مؤنث، برا یا بھلا۔

اس آیت میں مذکر اور مونث کا قصہ زیادہ تر عوامی ذوق کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ عوام کو چوں کہ اس سے بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے کہ ان کے یہاں پیدا ہونیوالی اولاد لڑکا ہے یا لڑکی، اس لیے یہ تفسیر مشہور ہو گئی۔ ورنہ خود قدیم تفاسیر میں شقی اور سعید کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ یعنی یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ پیدا ہونے والا بڑا ہو کر برا نکلے گا یا بھلا ثابت ہوگا۔ "برا اور بھلا" کے الفاظ انتہائی عام اور وسیع ہیں ان میں انسان کی زندگی سے متعلق ہر بات موجود ہے۔ انسان زیادہ عمر کو پہنچ کر جو کچھ بنتا ہے وہ سب ان دو لفظوں میں شامل ہے۔

مذکر اور مؤنث کے بارے میں پہلے بھی انسان اندازے کرتا تھا اور موجودہ زمانہ میں مزید اضافہ کے ساتھ اس کا اندازہ کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ تاہم اصل بات بدستور انسان کے لیے لامعلوم ہے اور وہ یہ کہ مکمل معنوں میں پیدا ہونے والے کے بارے میں پیشین گوئی کی جائے کہ وہ کیسا عورت یا مرد ثابت ہوگا اور کیسا عورت یا مرد ثابت نہیں ہوگا۔ رحم مادر کا یہ راز اب بھی انسان کے لیے لامعلوم ہے۔

ایمانی برکتیں

دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ جامد اور نمو پذیر۔ جامد وہ ہے جو یکساں طور پر اپنی حالت پر باقی رہے۔ نمو پذیر وہ ہے جو ہمیشہ بڑھتا رہے۔ پتھر پہلی چیز کی مثال ہے اور درخت دوسری چیز کی مثال۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کوئی جامد چیز نہیں۔ وہ درخت کی طرح اضافہ پذیر چیز ہے۔ وہ برابر بڑھتا رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ درخت اپنے مادی وجود کے اعتبار سے بڑھتا ہے اور مومن کا ایمان اپنے شعوری وجود کے اعتبار سے۔ درخت کا بڑھنا یہ ہے کہ اس کی لکڑی اور پتی بڑھے۔ ایمان کا بڑھنا یہ ہے کہ اس کی معرفت بڑھے۔ اس کا یقین بڑھے۔ اس کا اعتماد علی اللہ بڑھے۔ اس کی ربانی گہرائیوں میں اضافہ ہو۔

اس اضافۂ ایمان کے دو خاص راستے ہیں۔ ایک فکر اور دوسرا صبر۔ آدمی جب اللہ کو یاد کرتا ہے۔ جب وہ اللہ کی کاریگری میں غور کرتا ہے تو اس کا شعورِ ایمان بڑھتا ہے وہ معرفت کے نئے نئے پہلوؤں کا تجربہ کرتا ہے۔ اسی طرح موجودہ امتحان کی دنیا میں جب وہ مختلف قسم کے ناموافق حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ اور ان حالات میں وہ اپنے ایمانی تقاضوں پر قائم رہتا ہے تو اس کے ذریعہ سے وہ اپنی ایمانی قوت کو بڑھاتا ہے۔ وہ اپنے ایمان کو پختہ سے پختہ تر کرتا چلا جاتا ہے

فکر کی راہ سے اضافہ

آدمی کے ایمان میں فکر کی راہ سے جو اضافہ ہوتا ہے، اس کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک آیت یہ ہے:

واذا ما انزلت سورۃ فمنھم من یقول ایکم   اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو ان میں سے بعض

زادتہ ھٰذہٖ ایمانا۔ فاما الذین اٰمنوا فزادتھم ایمانا وھم یستبشرون۔ (التوبۃ ۱۲۴)

کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھا دیا۔ پس جو ایمان والے ہیں ان کا ایمان اس نے بڑھا دیا اور وہ خوش ہو رہے ہیں۔

قرآن میں خالق کا تعارف ہوتا ہے۔ انسان کے اندر چھپے ہوئے بندگی کے احساسات کو ابھارا جاتا ہے۔ یہ چیزیں آدمی کے ذہن کو جگاتی ہیں۔ وہ اس کے لاشعور کو شعور کی سطح پر لے آتی ہیں۔ وہ اس کے اندر خالق و مخلوق کے تعلق کو زیادہ اجاگر کرتی ہیں۔ اس طرح قرآن کو سن کر اور پڑھ کر آدمی کا شعورِ ایمان بڑھتا ہے اور برابر بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے رب سے جا ملے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارہ میں روایات میں آتا ہے کہ وہ اپنے اصحاب میں سے ایک یا دو آدمی کا ہاتھ پکڑتے اور کہتے کہ آؤ ہم اپنے ایمان میں اضافہ کریں (کان عمر رضی اللہ عنہ یاخذ بید الرجل والرجلین من اصحابہ فیقول تعالوا حتی نزداد ایماناً، مظہری ار ۳۲۶)

حضرت عبد اللہ بن رواحہ کا ایک واقعہ امام بیہقی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

عن عطاء بن یسار۔ ان عبد اللہ بن رواحۃ قال لصاحب لہ تعال۔ حتی نؤمن ساعۃ۔ فقال أولسنا بمومنین قال بلیٰ۔ ولکنا نذکر اللہ فنزداد ایمانًا۔

عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن رواحہ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ آؤ ہم ایک گھڑی کے لیے ایمان لائیں۔ ساتھی نے کہا، کیا ہم مومن نہیں ہیں۔ عبد اللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ ہاں۔ مگر ہم اللہ کو یاد کرتے ہیں تو ہم ایمان میں بڑھ جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ آؤ ہم بیٹھ کر اللہ کی بڑائی بیان کریں۔ ہم اللہ کے کمالات کو یاد کریں۔ ہم اللہ کے آلاء (کرشموں) کا اجتماعی تذکرہ کریں۔ اس سے اللہ کے بارہ میں ہمارا احساس تازہ ہوگا۔ اللہ کے بارہ میں ہمارا الیقین بڑھے گا۔ اللہ کے بارہ میں ہماری معرفت مزید ترقی کرے گی۔

صحابہ کرام میں یہ مزاج قرآن کے مطالعہ سے بنا تھا جو اپنے پڑھنے والے کو بار بار اکساتا ہے کہ وہ ذکر و فکر کے ذریعہ اپنے ایمان کو بڑھائے۔ وہ اپنے ایمان کو مسلسل ترقی دیتا رہے۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آپ اہل ایمان کا تزکیہ کرتے ہیں (ویزکیھم، البقرہ ۱۲۹) اس تزکیہ کا خاص پہلو یہی ہے۔ ابن جریر نے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:

قال ابوذر: ولقد ترکنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وما یقلب طائر جناحیہ فی السماء الا ذکر لنا منہ علما	حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا اور حال یہ تھا کہ ایک چڑیا بھی آسمان میں اپنا پر نہیں پھڑپھڑاتی تھی مگر آپ اس سے ہم کو ایک علم کی یاد دلاتے تھے۔
تفسیر ابن کثیر، جزء ۲، صفحہ ۱۳۱	

ذکر و فکر سے کس طرح ایمان بڑھتا ہے، اس کی ایک تازہ مثال لیجئے۔

جدید معلومات کے مطابق ہماری دنیا ناقابل قیاس حد تک بڑی دنیا ہے۔ سائنس داں کہتے ہیں کہ یہ کائنات اتنی زیادہ بڑی ہے کہ ایک ہوائی جہاز اگر روشنی کی رفتار سے روانہ ہو۔ یعنی اس کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سکنڈ ہو تو اس ناقابل قیاس حد تک تیز رفتار جہاز کو کائنات کے گرد ایک چکر لگانے میں ایک ارب سال سے زیادہ لگ جائیں گے۔ بشرطیکہ وہ جہاز اور اس کے مسافر اتنی لمبی مدت تک باقی بھی رہیں۔

اس عظیم کائنات میں بے شمار ستارے ہیں۔ دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرّے ہیں اس سے بھی زیادہ آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے۔ یہ ستارے بے حد بڑے ہیں۔ اتنے بڑے کہ ہماری زمین جیسی کروروں زمینیں کسی ایک ستارہ پر رکھ دی جائیں تب بھی اس کے اوپر جگہ باقی رہے گی۔ صرف ہماری کہکشاں میں ۱۰۰۰۰۰ ملین ستارے پائے جاتے ہیں۔

یہ تمام کے تمام ستارے آگ کے دہکتے ہوئے اتھاہ سمندر ہیں۔ ان میں انسانی آبادی کسی طرح ممکن نہیں۔ اس عظیم کائنات میں ایک ہی معلوم شمسی نظام ہے اور اس میں ہماری زمین جیسی ایک ہی زمین ہے۔ ساری کائنات میں کوئی بھی دوسرا معلوم کرہ نہیں جس میں پانی ہو، جس میں سبزہ ہو جس میں زندگی پائی جاتی ہو۔ جہاں وہ تمام چیزیں اور وہ تمام متوازن اسباب موجود ہوں جن سے تمدن کی تعمیر کی جاتی ہے۔

اس طرح کی ان گنت معلومات ہیں جو موجودہ زمانہ میں ہماری دنیا کے بارہ میں حاصل ہوئی ہیں۔ اگر آدمی ان معلومات کو سامنے رکھ کر غور کرے تو خالق کی عظمت کے احساس سے اس کا دل دہل

اٹھے گا۔ نیز یہی مطالعہ اس کو بتائے گا کہ کائنات کے خالق نے انتہائی استثنائی طور پر اس کے لیے یہاں زندگی اور ترقی کا سامان کیا ہے۔ اس احساس سے اس کے سینے میں شکر کا سمندر موجزن ہوجائے گا۔ یہ چیزیں اس کی معرفتِ حق میں بے پناہ اضافہ کردیں گی۔

جس زمانہ میں میں اپنی کتاب " مذہب اور جدید چیلنج " کے سلسلہ میں فلکیات اور ارضیات کا مطالعہ کر رہا تھا، مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے کہ میں کارخانہ کائنات میں خدا کو بالکل عیاناً دیکھ رہا ہوں۔ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، اعظم گڈھ کے ایک صاحب (شاہ نصیر احمد مرحوم) نے مجھ سے پوچھا: کیا انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ معاً میری زبان سے نکلا "کیا آپ نے ابھی تک خدا کو نہیں دیکھا"۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر واقعی معنوں میں ذکر و فکر کرے تو وہ خدا کو دیکھنے لگے۔ اس کا ایمان غیب سے آگے بڑھ کر شہود تک پہونچ جائے۔

صبر کی راہ سے اضافہ

ایمان میں اضافہ کا دوسرا ذریعہ وہ ہے جس کو صبر کہا جاتا ہے۔ صبر کا مطلب ہے جمنا۔ آدمی کے سامنے جب ایسی صورت حال آئے کہ دین پر قائم رہنے کے لیے اسے قربانی دینی ہو، اسے اپنے جذبات کو کچلنا پڑے، خدا کا خوف اسے مجبور کر دے کہ وہ اپنی سوچ کو موڑ کر خدائی سوچ کے تابع کرے اس قسم کا ہر عمل صبر ہے اور جب آدمی اس قسم کا عمل کرتا ہے تو وہ خدا کے حق میں اپنی قوت ارادی کو بڑھاتا ہے، وہ خدا کے تعلق کا نیا تجربہ کرتا ہے۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں اسی قسم کی ایک مثال صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ صلح حدیبیہ تمام تر دشمن کی یک طرفہ شرائط پر کی گئی تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام اس پر سخت برہم تھے، ان کا دل و دماغ کسی طرح تیار نہ تھا کہ اس قسم کی ذلت آمیز صلح پر راضی ہوجائیں۔ مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اس وقت اللہ کی مرضی یہی ہے تو سب نے جذبات کے طوفان کے باوجود اپنے آپ کو اس کے آگے جھکا دیا۔ انھوں نے اپنے دماغ کا سانچہ خود اپنے ہاتھوں سے توڑ دیا۔ اس کا فوری فائدہ انھیں یہ ملا کہ ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا۔ قرآن میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے:

ھو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المومنین	وہ اللہ ہی ہے جس نے مومنین کے دل پر اطمینا

لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم (الفتح ۴) | اتارا تاکہ ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو جائے ۔

حدیبیہ کے موقع پر دشمن نے صلح کی یک طرفہ شرطیں پیش کیں تھیں ۔ صحابہ جب اللہ کی خاطر ان یک طرفہ شرطوں پر راضی ہوئے تو انھوں نے ایک نئے ایمان کا تجربہ کیا ۔ پہلے اگر انھوں نے اللہ کو بطور ایک خارجی واقعہ کے مانا تھا تو اب انھوں نے اللہ کو اپنی نفی کی قیمت پر مانا ۔ اس واقعہ کے ذریعہ انھوں نے اس ایمان کا تجربہ کیا کہ اپنی بڑائی ختم ہو تب بھی وہ خدا کے حکم کو مانیں ۔ اپنی خواہشات پامال ہوں تب بھی وہ خدا کے طریقہ کو نہ چھوڑیں ۔ اپنا ذہنی سانچہ ٹوٹے تب بھی وہ اپنی رائے کو خدا کی رائے کے تابع کریں ۔ یہ ہے ایمان پر ایمان کا اضافہ ۔

ایک حدیث

اضافۂ ایمان کے اس معاملہ کو ایک حدیث قدسی میں تمثیل کے انداز میں واضح کیا گیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

اذا ابتلیت عبدی المومن فصبر فلم یشکنی الی عوادہ اطلقتہ من اساری ثم ابدلتہ لحما خیرا من لحمہ و دما خیرا من دمہ ثم یستأنف العمل

(رواہ الحاکم عن ابی ھریرہ)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ، جب میں اپنے مومن بندے کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہوں پھر وہ صبر کرتا ہے ، وہ حال پوچھنے والوں سے شکایت نہیں کرتا تو میں اس کو اپنی قید سے آزاد کر دیتا ہوں ۔ پھر میں اس کے گوشت کو زیادہ بہتر گوشت سے بدل دیتا ہوں اور اس کے خون کو زیادہ بہتر خون سے بدل دیتا ہوں ۔ پھر وہ از سرِ نو عمل کرنے لگتا ہے ۔

تکلیف پر صبر کرنا یہ ہے کہ آدمی تکلیف کے حالات میں بھی حق پر قائم رہے ۔ جب آدمی ایسا کرتا ہے تو وہ اس حقیقت کا تجربہ کرتا ہے کہ جو حق اس نے پایا ہے وہ ہر دوسری چیز سے زیادہ بڑا ہے ۔ ہر دوسری چیز کو کھونا قابلِ برداشت ہے ، مگر حق کو کھونا اس کے لیے قابلِ برداشت نہیں ۔

اس تجربہ سے پہلے حق اگر اس کی نگاہ میں بہت سی چیزوں میں سے ایک چیز تھا تو اب حق اس کے لیے تمام چیزوں سے زیادہ بڑا اور قیمتی بن جاتا ہے۔ ایسی آزمائش کے موقعہ پر جو شخص صبر کا ثبوت دے اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھر آتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے اندر ایک نئے انسان کا تجربہ کرتا ہے اس کا خون اب نیا خون اور اس کا گوشت اب نیا گوشت بن جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کے کردار میں نئی جان آجاتی ہے۔ اس کا عمل ایک نئے انسان کا عمل بن جاتا ہے۔

۱۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ایک پیغمبر تھے۔ ان کے یہاں پہلی بیوی سے دو اولاد ہوئی۔ ایک یوسف، دوسرے بن یمین۔ یہ دونوں بھائی ابھی چھوٹے تھے کہ ان کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت یعقوب نے دوسرا نکاح کیا جس سے دس لڑکے پیدا ہوئے۔ سوتیلے بھائیوں کو شکایت ہوئی کہ ان کے والد یوسف کو زیادہ مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ حضرت یوسف کے دشمن ہوگئے۔ حضرت یوسف کی عمر تقریباً ۱۶ سال تھی کہ ان کے سوتیلے بھائی ان کو ایک سنسان مقام پر لے گئے اور وہاں ان کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔ اس کے بعد انھوں نے آپ کے ایک کپڑے کو جانور کے خون میں رنگا اور اس کو اپنے والد کو دکھا کر کہہ دیا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔

حضرت یعقوب اپنے بیٹوں میں سے حضرت یوسف کو سب سے زیادہ مانتے تھے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کو اس کا بے حد صدمہ ہوا۔ حتی کہ غم سے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں۔ مگر اس دردناک حادثہ پر انھوں نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ قرآن کے مطابق انھوں نے اس پر صبر کرلیا اور زبان سے صرف یہ کہا:

انّما اشکوا بثّی وحزنی الی اللہ ۔ میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد صرف اللہ سے کرتا ہوں۔ (یوسف ۸۶)

حضرت یعقوب پر جو غم پڑا تھا وہ بظاہر انسانوں کی طرف سے آیا تھا مگر اس کے بارہ میں وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کو انھوں نے خدا سے کہنا شروع کردیا۔ اپنی توجہ کو انھوں نے انسانوں سے ہٹا کر خدا کی طرف کرلیا۔ اس طرح انھوں نے اس اعلیٰ حقیقت کا تجربہ کیا کہ واقعات خواہ بظاہر انسانوں کی طرف سے پیش آئے ہوں مگر حقیقۃً وہ خدا کی اجازت کے تحت ہوتے ہیں۔ اور وہی تنہا یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ آدمی کے کھوتے کی تلافی کرسکے۔

۲۔ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی۔ مگر بعد کو ایک غلطی کی وجہ سے فتح شکست میں تبدیل ہوگئی اور مسلمانوں کو زبردست جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے:

فاثابکم غمّاً بغمٍّ لکیلا تحزنوا علیٰ ما فاتکم ولا ما اصابکم واللہ خبیر بما تعملون (آل عمران ۱۵۳)

پھر اللہ نے تم کو رنج پر رنج دیا تاکہ جو کچھ تم سے کھویا جائے یا جو مصیبت تم پر پڑے اس پر تم غمگین نہ ہو۔

احد کی جنگ میں شکست رسول کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ وہ براہ راست اللہ کے علم میں تھی۔ مگر اللہ نے اس کو ہونے دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے شعور ایمان میں اضافہ ہو۔ ان کے اندر یہ طاقت پیدا ہو کہ وہ کھونے کو برداشت کر سکیں۔ وہ ایک چیز کو کھو کر جانیں کہ دوسری اس سے زیادہ بڑی چیز اب بھی ان کے پاس موجود ہے اور وہ ان کا عقیدہ ہے۔

ایمان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی دنیا کو کھونے کے بعد بھی خدا کو نہ کھوئے۔ نقصان اس کے لیے اس تجربہ کا ذریعہ بن جائے کہ فانی چیزوں کے درمیان ایک ایسی چیز بھی موجود ہے جو کبھی فنا نہ ہو جو کبھی آدمی سے کھوئی نہ جائے۔ دنیا کے کھونے کو برداشت کر کے اپنے اندر اس قسم کا احساس زندہ کرنا گویا ایک قسم کا ذہنی سفر کرنا ہے۔ یہ اپنے آپ کو مزید آگے کی طرف لے جانا ہے۔ جو شخص اس غیر فانی سرمایہ کو پالے وہ محرومیوں کی اس دنیا میں کبھی احساس محرومی سے دوچار نہ ہوگا۔

۳۔ غزوۂ بنی المصطلق (۶ھ) کے بعد مدینہ کے کچھ شرپسندوں نے ایک معمولی واقعہ کو شوشہ بنایا اور اس کو غلط رُخ دے کر حضرت عائشہ صدیقہؓ پر نعوذ باللہ جھوٹا الزام لگایا۔ حضرت عائشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ اور حضرت ابو بکر کی صاحبزادی تھیں۔ قدرتی طور پر حضرت ابو بکر کو اس کا بے حد رنج ہوا۔ کسی باپ کے لیے اس سے زیادہ تکلیف کی بات اور کوئی نہیں کہ اس کی پاکباز لڑکی پر بدکاری کا جھوٹا الزام لگایا جائے۔

اس جھوٹی مہم میں مدینہ کے ایک سادہ لوح مسلمان بھی شریک ہوگئے تھے جن کا نام مسطح بن اثاثہ تھا۔ یہ حضرت ابو بکر کے ایک غریب رشتہ دار تھے اور حضرت ابو بکر ان کی ماہانہ امداد کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے شدت احساس کے تحت قسم کھائی کہ اب میں مسطح کی کوئی مدد

نہیں کروں گا۔ اس پر قرآن میں یہ آیت اتری :

ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یوتوا اولی القربی والمساکین والمھاجرین فی سبیل اللہ۔ ولیعفوا ولیصفحوا۔ الا تحبون ان یغفر اللہ لکم واللہ غفور رحیم۔

(النور ۲۲)

تم میں سے جو لوگ فضل اور وسعت والے ہیں وہ اس کی قسم نہ کھالیں کہ وہ اپنے رشتہ دار اور مسکین اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہ کریں گے۔ چاہیے کہ وہ انھیں معاف کردیں اور درگذر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کردے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

حضرت ابو بکر نے یہ آیت سنی تو فوراً کہا : خدا کی قسم ہم ضرور چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو ہمیں معاف کردے (بلی واللہ انا نحب ان تغفر لنا یا ربنا)

اس سے پہلے حضرت ابو بکر ایک ایسے "مسطح" کی مدد کر رہے تھے جس سے انھیں کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔ اب مسطح کی مدد کرنا ایک ایسے شخص کی مدد کرنا تھا جس سے انھیں سخت چوٹ پہونچی تھی۔ پہلے اگر وہ نفس سے لڑے بغیر مسطح کی مدد کر رہے تھے تو اب ان کے فیصلہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ نفس سے لڑکر مسطح کی مدد کریں گے۔ اس طرح انھوں نے سیکھا کہ غصہ کو الگ کرکے ایک شخص کے ساتھ سلوک کریں۔ انھوں نے جانا کہ صرف معمول کے حالات میں مومنانہ اخلاق نہیں برتنا ہے۔ بلکہ غیر معمولی حالات میں بھی مومنانہ اخلاق برتنا ہے۔ ان کے اس عمل نے ان کے ایمان کو ایک درجہ اوپر کردیا۔

۴۔ حضرت عائشہ صدیقہ پر نعوذ باللہ برائی کا جو الزام لگایا گیا، اس سلسلہ میں مدینہ میں بہت سے واقعات پیش آئے۔ ان میں سے ایک واقعہ روایات میں اس طرح آیا ہے :

عن افلح مولیٰ ابی ایوب قالت لہ امراتہ ام ایوب یا ابا ایوب الا تسمع ما یقول الناس فی عائشۃ۔ قال بلیٰ وذالک الکذب۔ افکنت یا ام ایوب فاعلۃ

حضرت ابو ایوب انصاری کے غلام افلح کہتے ہیں کہ ان کی بیوی ام ایوب نے ان سے کہا کہ اے ابو ایوب کیا آپ نے نہیں سنا کہ عائشہ کے بارے لوگ کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ اور وہ

ذالك۔ قالت لا واللہ۔ قال فعائشۃ واللہ خیر منک

جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب کیا تم ایسا کروگی۔ ان کی بیوی نے کہا کہ خدا کی قسم نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے بہتر ہیں۔

(تفسیر ابن کثیر ۳/۲۷۲)

حضرت عائشہ صدیقہ پر جو الزام لگایا گیا اس کے معاملہ میں ایک طریقہ ان لوگوں کا تھا جن کا حال یہ تھا کہ انھوں نے جو کچھ سنا اس کو بلا تحقیق بیان کرنے لگے۔ مگر حضرت ابو ایوب نے اپنے آپ کو اس سے اوپر اٹھایا۔ انھوں نے معاملہ کو اپنی عقل سے جانچا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ خود ایسا نہیں کر سکتے اس لیے انھوں نے کہہ دیا کہ عائشہ نے بھی ایسا نہیں کیا۔

یہ ایک شعوری صبر کا واقعہ تھا۔ حضرت ابو ایوب نے جب ایسا کیا تو حدیث کے الفاظ میں ان کا خون زیادہ بہتر خون اور ان کا گوشت زیادہ بہتر گوشت بن گیا۔ ان کے اندر وہ شخصیت پیدا ہوئی جو دوسرے کے معاملہ کو اپنا معاملہ بنا کر دیکھے۔ وہ ہر معاملے کو اصول کی روشنی میں جانچے نہ کہ سطحی خواہشات کی روشنی میں۔

خلاصہ

ایک اسلام معمول والا اسلام ہے۔ دوسرا اسلام وہ ہے جب کہ آدمی معمول کے خلاف اسلام پر عمل کرے۔ خدا کی دنیا کو ظاہری طور پر دیکھنا بھی خدا کی یاد دلاتا ہے۔ مگر جب آدمی دنیا کے ظاہر سے گزر کر اس کے اندرونی عجائب پر غور کرتا ہے تو اس کی معرفت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ معتدل حالات میں اخلاق برتنا بھی ایک اچھا کام ہے۔ مگر جب آدمی ایک ایسے شخص سے اخلاق برتے جس سے اس کے تعلقات خراب ہو گئے ہوں تو وہ ایسے ایمان کا تجربہ کرتا ہے جس کا اس نے پہلے تجربہ نہیں کیا تھا۔ ایک ایسے شخص سے انصاف کرنا بھی انصاف ہے جس سے آپ کا بناؤ ہو۔ مگر جب آپ ایک ایسے شخص سے انصاف کریں جس سے آپ کا بگاڑ ہے تو اس وقت آپ کا عمل سادہ معنوں میں محض انصاف کا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ آپ کو خدا سے براہ راست ملانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ عمل کے دوران ایمان کی یہی مزید خوراک ہے جس کو اضافۂ ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان ہمیشہ بڑھتا ہے۔ مگر یہ بڑھنا ہمیشہ اس نسبت سے ہوتا ہے جتنا آدمی کے اندر حوصلہ ہو۔

حصہ دوم

ایمان اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ایمان ایک طرف آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں پتھر کی طرح جامد نہ رہے، بلکہ درخت کی طرح ہمیشہ بڑھنے والا اور ترقی کرنے والا وجود بن جائے۔ اسی طرح ایمان آدمی کے اندر وہ اعلیٰ صفت پیدا کرتا ہے جو دنیا میں ہر قسم کی کامیابی کا واحد یقینی ذریعہ ہے۔ اس صفت کا نام ایک لفظ میں صبر ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ان اللّٰہ مع الصابرین (اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: اعلم ان النصر مع الصبر (جان لو کہ خدا کی مدد صبر کے ساتھ وابستہ ہے) یعنی اللہ بلاشبہ سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اللہ کی مدد کامیابی کا یقینی ذریعہ ہے۔ مگر اللہ کی مدد کا دروازہ صرف اس شخص یا گروہ کے لیے کھلتا ہے جو مشکل پیش آنے کے وقت صبر کا ثبوت دے۔ مدد ہمیشہ اللہ کی طرف سے آتی ہے مگر اس کو لینے کے لیے بندے کی طرف سے صبر کا پیمانہ درکار ہے۔

یہ کوئی پر اسرار قسم کی اعتقادی بات نہیں۔ بلکہ یہی اس دنیا کے لیے خدا کا عام قانون ہے۔ اس قانون کو زیادہ واضح طور پر قرآن کی سورۃ نمبر ۹۴ میں بیان کیا گیا ہے جس کا نام الانشراح ہے۔ اس سورۃ میں اسی بات کو ان لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ انّ مع العسر یسرا (بلاشبہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے) یعنی اس دنیا میں خدا نے آسانیوں کو مشکلات کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ یہاں جو شخص آسانی کی منزل تک پہونچنا چاہے اس کو جاننا چاہیے کہ وہ دشواریوں سے بھرے ہوئے راستے سے گزر کر ہی اپنی منزل مقصود تک پہونچ سکتا ہے۔ یہ اس دنیا کے لیے خدا کا قانون ہے اور اس قانون میں کوئی استثنار نہیں۔

مشکل میں آسانی

سورہ الانشراح یا سورہ الم نشرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اس دور میں اتری جس کو مکی دور کہا جاتا ہے۔ اس وقت مکہ کے حالات بہت سخت تھے۔ اس وقت کے مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو ناقابل بیان تکلیفوں میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔ تکلیف

کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو قدیم مکہ کے لوگوں نے آپ پر نہ ڈالی ہو۔

حضرت طارق بن عبداللہ المحاربی کہتے ہیں کہ میں نے بعثت کے ابتدائی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذو المجاز کے بازار میں پہلی بار دیکھا تھا۔ آپ لوگوں کے درمیان یہ کہتے ہوئے گزر رہے تھے کہ : یا ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا (اے لوگو کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤگے) آپ یہ کہتے جاتے تھے اور ایک شخص آپ کے پیچھے آپ کو پتھر مارتا ہوا چل رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کہتا جاتا تھا : یا ایھا الناس لا تطیعوہ فانہ کذاب (اے لوگو اس کی بات نہ مانو کیوں کہ وہ جھوٹا ہے)

حضرت عروہ ابن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے ایک بار عبداللہ بن عمرو بن العاص سے کہا کہ قدیم مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تکلیف پہونچاتے تھے اس کا کچھ حال بیان کیجئے۔ عبداللہ بن عمرو نے کہا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حطیم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں عقبہ بن ابی معیط آیا۔ اس نے آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اتنے زور سے کھینچا کہ آپ کا گلا گھٹنے لگا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ قدیم مکہ میں اسلام کے دشمن آپ کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتے تھے۔

مکہ کے ابتدائی سالوں میں یہ حال تھا کہ نماز پڑھنا یا قرآن کی تلاوت کرنا بھی مشرکین کو گوارا نہ تھا۔ ابن ہشام اپنی سیرت کی کتاب میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو نماز پڑھنا ہوتا تو وہ پہاڑ کی گھاٹیوں میں چلے جاتے۔ وہ اپنی نماز کو اپنی قوم سے چھپاتے تھے۔ (کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا صلّوا ذھبوا فی الشعاب واستخفوا بصلاتھم من قومھم، صفحہ ۲۷۵)

قدیم مکہ کے مشرکین صرف برا بھلا کہنے پر نہیں رکتے تھے، وہ باقاعدہ مار پیٹ بھی کرتے تھے۔ وہ ہر طرح مسلمانوں کو ستاتے تھے جس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔

یہی سخت حالات تھے جب کہ قرآن میں یہ آیت اتری :

فان مع العسر یسرا	پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔
ان مع العسر یسرا	بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے

ابن جریر نے ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے :

خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوماً مسروراً وھو یضحک وھو یقول : لن یغلب عسر یسرین لن یغلب عسر یسرین فان مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نکلے ۔ آپ خوش تھے اور ہنس رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے کہ ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی ۔ ایک مشکل دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی ۔ کیوں کہ قرآن میں ہے کہ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے ، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے ۔

یہ آیت موجودہ دنیا میں خدا کے قانون کو بتا رہی ہے ، اس دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جب بھی آدمی کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے مشکلات آتی ہیں ۔ مگر ہر مشکل میں آسانی کا پہلو بھی موجود ہوتا ہے ۔ یہاں ہر ڈس ایڈوانٹج میں ایڈوانٹج چھپا ہوا ہوتا ہے اس لیے یہاں آدمی کو یہ کرنا چاہیے کہ جب بھی مشکل پیش آئے تو وہ مشکل میں چھپی ہوئی آسانی کو دریافت کرے ، وہ ڈس ایڈوانٹج میں ایڈوانٹج کو پالے ۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے ۔ جو لوگ اس راز کو دریافت کر سکیں وہ کامیاب ہیں اور جو لوگ اس راز کو دریافت نہ کر سکیں وہی وہ لوگ ہیں جو ناکام ہو گئے ۔

انسانی علم کی تصدیق

زندگی کی یہ حقیقت جو قرآن میں بیان کی گئی ہے ، یہ اتنی واضح ہے کہ علماء نفسیات جنھوں نے انسان کا مطالعہ خالص علمی انداز سے کیا ہے انھوں نے بھی اس راز کو پالیا ہے ۔ اور اس کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے ۔

یہاں میں مشہور عالم نفسیات ڈاکٹر الفرڈ ایڈلر (۱۹۳۷ — ۱۸۷۰) کا حوالہ دوں گا ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے احساس کمتری (Inferiority feeling) کا لفظ استعمال کیا ۔ اور اس کی سختی سے تردید کی ۔

الفرڈ ایڈلر نے پوری زندگی اس مطالعہ میں صرف کر دی کہ انسان کیا ہے اور وہ کس طرح اپنی قوتوں کو استعمال کرتا ہے ۔ وہ ایک ممتاز ترین ماہر نفسیات تھا ۔ اس نے تمام عمر کے مطالعہ کے بعد ایک کتاب

لکھی جس کا نام ہے (The Individual Psychology) اس میں اس نے لکھا ہے کہ انسانوں کے اندر میں نے ایک انتہائی حیرت ناک خصوصیت پائی ۔ ان کی یہ طاقت کہ وہ ایک نہیں کو ہے میں تبدیل کرسکیں :

...... their power to turn a minus into a plus.

الفرڈ ایڈلر نے جس چیز کو انسان کی طرف منسوب کیا ہے ۔ وہ دراصل خدا کا عطیہ ہے ۔ انسان بلاشبہ اس دنیا میں اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کرتا ہے ۔ مگر یہ معجزہ انسانی طاقت کی بنا پر نہیں ہوتا ۔ وہ اس لیے ہوتا ہے کہ خدا نے اس دنیا کو اس ڈھنگ سے بنایا ہے کہ اس کے اندر یہ امکان بے پناہ حد تک موجود ہے کہ ناموافق حالات کبھی بھی انسان کے لیے آخری اور کلی معنوں میں ناموافق نہ بنیں یہاں ہمیشہ ناموافق میں موافق پہلو موجود رہے تاکہ انسان اس کو استعمال کرکے کامیابی کی منزل تک پہونچ سکے ۔

یہاں ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کا ذکر کریں گے جو اس حقیقت کی زندہ مثال ہیں ۔ یہ واقعات بتاتے ہیں کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ جو عسر پیش آیا ، کس طرح اس کے اندر خدا نے یسر کا پہلو رکھ دیا تھا ۔ اور اللہ کے یہ بندے جب منفی نفسیات کا شکار نہیں ہوئے تو انھیں اس پہلو کو جاننے میں دیر نہیں لگی ۔ انھوں نے یسر کے پہلو کو استعمال کرکے تاریخ کے رُخ کو موڑ دیا ۔ جو واقعہ بظاہر ان کے خلاف جارہا تھا اس کو انھوں نے اپنے موافق بنا لیا ۔

مخالفت سے رفع ذکر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ سے مکہ میں اسلام پھیل گیا اور لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا ۔ یہاں ابن ہشام نے یہ الفاظ لکھے ہیں : ثم دخل الناس فی الاسلام ارسالاً من الرجال والنساء حتی فشا ذکر الاسلام بمکۃ ، وتُحُدِّثَ بہ ، صفحہ ۲۷۴ (پھر عورتوں اور مردوں کی ایک جماعت اسلام میں داخل ہوگئی ، یہاں تک کہ اسلام کا ذکر مکہ میں پھیل گیا اور اس کا چرچا کیا جانے لگا ۔

قریش نے جب یہ دیکھا کہ اسلام کی رفتار دن بدن بڑھ رہی ہے تو ان کے سردار ولید بن مغیرہ کے مکان پر جمع ہوئے ۔ انھوں نے یہ مشورہ کیا کہ حج کا موسم قریب آگیا ہے اور تمام عرب کے قبائل مکہ میں جمع ہوں گے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ محمد کی باتوں سے متاثر ہو جائیں ۔ اس لیے ہمیں پہل کرکے آنے والے قبائل

سے کوئی ایسی بات کہدینی چاہیے کہ وہ محمد کی طرف سے بدگمان ہو جائیں اور ان کی طرف دھیان نہ دیں۔

اس سلسلہ میں مختلف سرداروں نے مختلف رائیں دیں۔ آخری مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ عرب کے وفود جب حج کے موسم میں مکہ میں جمع ہوں تو تمام سرداران کے درمیان جائیں اور انھیں قومی تفریق پیدا کرنے والا بتا کر لوگوں کو ان سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔

اس وقت مکہ میں اسلام بہت کمزور حالت میں تھا۔ ایسی حالت میں مکہ کے تمام سرداروں کا متفق ہو کر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا بظاہر ایک مایوس کن بات تھی۔ عرب کے قبائل پر مکہ کے سرداروں کا زبردست اثر تھا۔ اس لیے ان کا متفقہ طور پر اسلام کے خلاف کھڑا ہونا بظاہر یہ معنی رکھتا تھا کہ لوگ اسلام سے بدک جائیں اور اس کے پیغام کو سننے کے تیار نہ ہوں۔

مگر یہ واقعہ کا ایک پہلو تھا۔ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس طرح اسلام کی زبردست تشہیر ہو گئی۔ نتنے بڑے پیمانے پر لوگوں نے اسلام کو جان لیا جن کو بتانا اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے ممکن نہ تھا۔ مکہ کے سردار اگرچہ اسلام کی مخالفت میں بولتے تھے۔ مگر انسان کی یہ نفسیات ہے کہ جس چیز کی مخالفت کی جائے اس کے بارے میں اس کے اندر تجسس (Curiosity) پیدا ہوتا ہے۔ وہ سنی ہوئی بات پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ مزید اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسلام کو جاننے کے لیے ان کے اندر مزید اشتیاق بڑھ گیا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قدرتی طور پر سرداروں کی اس مخالفانہ مہم پر غم زدہ تھے۔ مگر قرآن نے اس واقعہ کے دوسرے پہلو کو لیا اور قرآن میں یہ آیت اتری :

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا مذکور بلند کیا) قریش کی مہم ایک اعتبار سے مخالفانہ پروپیگنڈے کی مہم تھی۔ مگر دوسرے اعتبار سے وہ اسلام کا چرچا کرنے کی مہم تھی۔ قرآن نے دوسرے پہلو کو لیتے ہوئے بتایا کہ اس مہم کے تاریک پہلو میں ایک روشن پہلو چھپا ہوا ہے۔ جو چیز ایک پہلو سے مخالفانہ پروپیگنڈا ہے وہ دوسرے پہلو سے رفع ذکر ہے۔ تم اس دوسرے پہلو کو جانو اور اس کو استعمال کرو۔

اس طرح اس وقت کے مسلمانوں کو سوچ کی ایک مثبت لائن مل گئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ قریش کے پیدا کیے ہوئے تجسس کو وہ اسلام کی تبلیغ کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ پہلے سے زیادہ متحرک ہو گئے۔ جو لوگ قریش کے پروپیگنڈے کی وجہ سے اس سوال سے دوچار تھے کہ — "یہ نیا دین کیا ہے"

ان کو بتایا کہ اسلام کا اصل پیغام یہ ہے ۔ اس طرح اچانک اسلام کا رفع ذکر ہو گیا ۔ مسلمانوں کی اپنی کوشش سے برسوں میں جتنا اسلام پھیلا تھا ، دشمنوں کی مخالفت کے بعد وہ اس سے کئی گنا زیادہ مقدار میں تھوڑے دنوں میں پھیل گیا ۔

تاخیر نعمت بن گئی

قدیم مکہ کے لوگوں نے اسلام کے خلاف جو تدبیریں کیں ان میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ انھوں نے اپنے دو خاص آدمی ، نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط مدینہ بھیجے ۔ وہ وہاں یہودی علماء سے ملے اور ان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حال بیان کیا ۔ انھوں نے کہا کہ تم لوگ اہل تورات ہو ، ہم تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ تم ہمارے آدمی کے بارہ میں بتاؤ ۔ یہود نے کہا کہ تم لوگ ان سے چند چیزوں کی بابت سوال کرو ۔ اگر وہ ان کے بارہ میں بتا دیں تو وہ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں اور اگر وہ نہ بتا سکیں تو وہ صرف باتیں بنانے والے ہیں ۔

(فإنْ أخبركم بهنّ فهو نبيٌّ مرسل والآخر جل متقوِّل)

ان باتوں میں سے ایک سوال اس شخص کے بارے میں تھا جو مشرق سے لے کر مغرب تک پہونچا ۔ دوسرا سوال ان نوجوانوں کے بارے میں تھا جو غار میں جا کر سو گیے ۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سوالات کو سنا تو فرمایا : اخبرکم غداً عما سألتم عنہ ۔ جن چیزوں کے بارے میں تم نے پوچھا ہے ان کے بارے میں تم کو میں کل بتاؤں گا ۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ نے یہ فرمایا مگر ان شاء اللہ نہ کہا ۔ آپ کو خیال تھا کہ حضرت جبریل کل آئیں گے تو ان سے پوچھ کر بتا دوں گا ۔ مگر خلاف معمول حضرت جبریل کل کے دن نہ آئے ۔ حتی کہ پندرہ دن گزر گیے اور حضرت جبریل نہ آئے ۔

یہ بے حد نازک معاملہ تھا ۔ یہودی علماء نے جن شخصیتوں کی بابت سوال کیا تھا وہ اس وقت عام لوگوں کے لیے سراسر نامعلوم شخصیتیں تھیں ۔ ان کا ذکر صرف یہود کے بعض نوشتوں میں تھا ۔ چونکہ اس وقت تک پریس کا دور نہیں آیا تھا ، یہ نوشتے صرف بعض یہودی علماء کے پاس تھے ۔ عام لوگوں کو ان کی مطلق کوئی خبر نہ تھی ۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کی بابت اس وقت کسی قسم کی کوئی اطلاع نہ تھی ۔

مکہ کے مشرکین ہر روز آپ سے پوچھتے۔ اور آپ سوال کا جواب نہ دے پاتے۔ اس طرح مکہ کے مخالفین کو موقع مل گیا کہ وہ آپ کا مذاق اڑائیں اور لوگوں سے کہیں کہ یہ سچے پیغمبر نہیں ہیں۔ اگر وہ سچے پیغمبر ہوتے تو یقیناً خدا انھیں بتا دیتا اور وہ سوال کا جواب دیدیتے۔

یہ ظاہر یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو اسلام کے خلاف تھا۔ یہ اسلام کی صداقت کو مشتبہ کر رہا تھا۔ مگر یہاں بھی "عسر" کے اندر ایک "یسر" چھپا ہوا تھا۔ وحی کا رکنا اور مخالفین کا اس کو استعمال کرکے پروپیگنڈا کرنا اپنے اندر ایک روشن پہلو رکھتا تھا۔ اس طرح یہ ہوا کہ سارے مکہ میں اسلام ایک سوالیہ نشان بن گیا۔ ہر گھر میں اس کا چرچا پہونچ گیا۔ پوری آبادی کے اندر سننے کی فضا پیدا ہو گئی۔

پندرہ دن وحی رکنے کے بعد حضرت جبریل سورہ الکہف لے کر آئے جس میں مذکورہ سوالات کا تفصیلی جواب تھا۔ عام حالت میں یہ سورہ اترتی تو اس کا اترنا لوگوں کو زیادہ قابلِ توجہ واقعہ نظر نہ آتا مگر اب وہ اتری تو سارا مکہ اس کو سننے کے لیے کان لگائے ہوئے تھا۔ چنانچہ اس کے اترتے ہی وہ سارے مکہ میں پھیل گئی۔ ہر آدمی اس کو جاننے کے لیے دوڑ پڑا کہ دیکھیں "محمد" نے ان سوالات کا کیا جواب دیا ہے ـــــ جو چیز بظاہر اسلام کے غیر موافق تھی وہ اسلام کے موافق بن گئی۔

ہجرت سے تبلیغ

مشرکین مکہ کی مخالفت کے باوجود اسلام برابر پھیل رہا تھا۔ مشرکین کی ہر تدبیر اسلام کی مزید اشاعت کا سبب بن رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر مکہ کے مشرکین اور زیادہ سخت ہو گیے۔ انھوں نے مسلمانوں کے اوپر اپنی سختیاں تیز تر کر دیں۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ مکہ کو چھوڑ کر باہر چلے جائیں (تفرقوا فی الارض فان اللہ سیجمعکم) لوگوں نے پوچھا کہ کہاں جائیں تو آپ نے فرمایا کہ حبش چلے جاؤ۔

حبش افریقہ کی طرف عرب کا ایک پڑوسی ملک ہے۔ دونوں کے درمیان بحر احمر حائل ہے۔ اس سمندر کی چوڑائی یمن کے پاس بہت کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قدیم زمانہ میں یہیں سے لوگ کشتیوں کے ذریعہ عرب سے حبش کا اور حبش سے عرب کا سفر کیا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورہ کے بعد رجب ۵ھ میں ایک درجن آدمی مکہ کو چھوڑ کر حبش چلے گیے۔ جلد ہی بعد دوسرا زیادہ بڑا قافلہ مکہ کو چھوڑ کر حبش گیا۔ ابن ہشام کے مطابق ان کی تعداد

۸۶ تھی۔ اس طرح مجموعی طور پر تقریباً ایک سو مسلمان افریقہ کے ملک حبش پہونچ گیے۔
بظاہر یہ واقعہ پسپائی کا واقعہ تھا۔ مگر خدا کے فضل سے اس کے اندر اقدام کا پہلو نکل آیا۔
یہ لوگ جو مکہ سے حبش گیے تھے یہ کوئی اسٹیچو نہ تھے بلکہ اسلام کے زندہ مبلغ تھے۔ ان کا حبش جانا قدرتی طور پر اسلام کے مبلغین کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم جانا بن گیا۔ ان کے حبش پہونچتے ہی سمندر پار کے اس ملک میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ ان کی دعوتی اور اخلاقی تاثیر سے حبش کے لوگوں میں اسلام پھیلنے لگا۔ حتی کہ جب اس کا چرچا بڑھا تو خود شاہ حبش نجاشی نے ان لوگوں کو اپنے دربار میں بلایا۔ جو حبش کے قدیم شہر اکسوم پر واقع تھا۔
اس وقت حضرت جعفر نے مسلمانانِ حبشہ کی نمائندگی کی۔ انھوں نے اسلام کے تعارف پر ایک تقریر کی۔ جو لوگ کسی مقصد کے لیے ستائے جائیں اور پھر بھی اس سے نہ پھریں خواہ اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دینا پڑے، ایسے لوگوں کی آواز میں قدرتی طور پر سوز پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے الفاظ دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں۔ چنانچہ حضرت جعفر نے جب بھرے دربار میں تقریر کی تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ حتی کہ خود شاہ نجاشی رونے لگا۔ اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ حضرت جعفر بظاہر ستائے گیے تھے۔ مگر اسی ستائے کے واقعہ نے آپ کے کلام میں وہ زور اور تاثیر پیدا کر دی جس نے بادشاہ کو اور اس کے تمام درباریوں کو تڑپا دیا۔
ہجرت حبشہ سے متعلق اس قسم کے بہت سے واقعات سیرت کی کتابوں میں آئے ہیں۔ اس طرح ایک بظاہر پسپائی کا واقعہ اقدام کا واقعہ بن گیا۔ اسلام کی دعوت ایشیا کے علاقہ سے نکل کر افریقہ کے علاقہ میں پہونچ گئی۔ اس کے بعد وہ افریقہ میں بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ افریقہ کا نصف سے زیادہ حصہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ایک مقامی دعوت عالمی دعوت میں تبدیل ہو گئی۔ اریٹریا کا علاقہ جو مسلم اکثریت کا علاقہ ہے، وہ اسی ہجرت حبشہ کے بعد وجود میں آیا۔

خاتمہ میں نیا آغاز

عُسر میں یُسر کے اسی امکان کی ایک مثال حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ آپ کا قصہ ابتداءً اسوء القصص معلوم ہوتا ہے۔ مگر قرآن کے الفاظ میں بالآخر وہ احسن القصص بن گیا۔ حضرت یوسف کے دشمنوں نے جہاں آپ کی تاریخ ختم کرنی چاہی تھی، وہیں آپ کے لیے ایک شاندار تاریخ

کے امکانات پیدا ہوگیے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں یہ نئے امکانات کیسے پیدا ہوئے ۔ اس کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ ملتا ہے : وقال ادخلوا مصر (یوسف ۹۹) وجاء کم من البدو (یوسف ۱۰۰) اس آیت میں اشارہ ہے کہ حضرت یوسف اور ان کے خاندان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص احسان یہ تھا کہ وہ ان کو دیہات سے نکال کر مصر جیسے متمدن ملک میں لایا اور وہاں کی راجدھانی میں ان کے قیام کے اسباب پیدا کیے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام فلسطین کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ۔ عام حالات میں وہ اسی گاؤں میں پڑے رہتے ۔ ان کی اعلیٰ صلاحیتیں گاؤں کے حالات میں اپنے ظہور کا راستہ نہ پاتیں ۔ مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ نوجوانی کی عمر میں آپ کے سوتیلے بھائیوں کو آپ سے ضد ہوگئی ۔ ان کی ضد یہاں تک پہونچی کہ وہ ایک روز آپ کو دور جنگل میں لے گیے اور آپ کو ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا ۔

بظاہر یہ ایک زبردست ناکامی کا واقعہ تھا ۔ مگر اس ڈِس ایڈوانٹج میں ان کے لیے ایک ایڈوانٹج نکل آیا ۔ وہ ایک تجارتی قافلہ کے ہاتھ لگ گیے جو مصر کی راجدھانی کی طرف تجارت کے لیے جا رہا تھا ۔ آپ کی پرکشش شخصیت کو دیکھ کر ان تاجروں کو دلچسپی ہوئی ۔ کیوں کہ انھیں امید ہوئی کہ وہ آپ کو مصر کے بازار میں فروخت کر کے کچھ رقم حاصل کر سکتے ہیں ۔ چنانچہ انھوں نے حضرت یوسف کو اپنے قافلہ میں شامل کر لیا اور ان کو لے جا کر مصر کی راجدھانی میں ایک سرکاری افسر کے ہاتھ فروخت کر دیا ۔

حضرت یوسف کا کنویں میں ڈالا جانا بظاہر ایک ناپسندیدہ واقعہ تھا ۔ مگر اسی ناپسندیدہ واقعہ کے اندر سے یہ امکان نکل آیا کہ وہ معمولی دیہات سے نکل کر ترقی یافتہ شہر میں پہونچیں ۔ اور اس طرح ان کی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے زیادہ وسیع میدان حاصل ہو ۔ چنانچہ یہی ہوا ۔ اپنے گاؤں میں وہ صرف بکریاں چرایا کرتے تھے ۔ مگر مصر میں آخر کار وہ ملک کے اقتدار تک پہونچا دیے گیے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں اسوۃ القصص بھی احسن القصص بن سکتا ہے ۔ بشرطیکہ آدمی تقوی اور صبر کا ثبوت دے ۔ تقویٰ آدمی کو سنجیدہ بناتا ہے ۔ اور صبر سے

آدمی کے اندر انتظار کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی دونوں چیزیں زندگی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہیں۔ سنجیدگی آدمی کو حقیقی اور درست رائے قائم کرنے میں مدد دیتی ہے اور انتظار کی طاقت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ بے فائدہ قسم کے عاجلانہ اقدام سے بچتا رہے۔ یہاں تک کہ وہ محفوظ طور پر اپنی منزل تک پہونچ جائے۔

مثبت شعور کی ضرورت

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ناموافق صورت حال میں ایک موافق امکان چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں کوئی استثنار نہیں۔ خدا کی اس دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں کہ آدمی کو صرف ناموافق حالات گھیرے ہوئے ہوں۔ اور کوئی موافق امکان اس کے لیے سرے سے موجود نہ ہو۔

مگر اس موافق پہلو کو پانے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے مثبت شعور کی ضرورت ہے۔ جب آدمی کسی ناموافق صورت حال میں گھر جائے تو عام طور پر وہ اس سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناموافق حالات بیشتر آدمیوں کو صرف ایک ہی تحفہ دیتے ہیں اور وہ ہے ردعمل میں مبتلا ہو جانا۔ جب آدمی ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے تو وہ اپنے حالات سے صرف مایوسی اور نفرت کی غذا لے گا۔ وہ اس سے کبھی مثبت فکر کی غذا نہیں لے سکتا۔

ناموافق حالات میں چھپے ہوئے موافق امکان کو جاننے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی قریبی حالات سے الگ ہو کر سوچ سکے۔ وہ اپنے آپ کو فکری اعتبار سے اس مقام پر لے جائے جہاں وہ غیر متاثر ذہن کے ساتھ رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

آدمی ہر تاریکی میں روشنی پا سکتا ہے۔ وہ ہر ناموافق صورت حال میں اپنے لیے ایک موافق پہلو ڈھونڈ سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو حقیقت پسند بنائے۔ وہ جھنجھلاہٹ کی نفسیات سے دور رہے۔ وہ دشمن کو بھی غیر دشمن کی نظر سے دیکھے۔ وہ اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنے آپ کو پڑھ سکے۔ اسی کا نام مثبت طرز فکر ہے اور اس دنیا میں بلاشبہ مثبت طرز فکر ہی کے اندر تمام کامیابیوں اور ترقیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

روزہ

غالباً ۱۹۴۳ کی بات ہے۔ گورکھ پور میں ایک بڑے مسلم افسر رہا کرتے تھے۔ رمضان کے مہینے میں کچھ روز کے لئے ان کے یہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے بنگلہ کے سامنے ایک علیحدہ بیٹھک بنی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ روزانہ صبح کو ایک "حافظ صاحب" قرآن بغل میں لئے ہوئے آتے ہیں۔ کچھ دیر بیٹھ کر تلاوت کرتے ہیں، پھر واپس چلے جاتے ہیں۔ "یہ کون صاحب ہیں جو روزانہ صبح کو یہاں آتے ہیں"۔ کئی روز تک یہ منظر دیکھنے کے بعد میں نے صاحب خانہ سے پوچھا۔ میرا سوال سن کر پہلے وہ ہنسے۔ اس کے بعد جواب دیا: "بات یہ ہے کہ میں روزہ نہیں رکھ پاتا۔ اس لئے میں نے حافظ صاحب کو مقرر کر دیا ہے کہ وہ رمضان کے پورے مہینے میں میرے یہاں آکر قرآن پاک کی تلاوت کر دیا کریں۔ مہینہ کے ختم پر ان کی کچھ خدمت کر دوں گا"

یہ ایک "بے روزہ دار" کا قصہ تھا۔ اب روزہ داروں کو دیکھئے۔ ایک بار میں نے اذان کی آواز آنے سے پہلے گھڑی دیکھ کر افطار کر لیا۔ کئی لوگ سنجیدگی سے اس شبہ میں پڑ گئے کہ میرا روزہ نہیں ہوا۔ آج کل کے روزہ داروں کا حال یہ ہے کہ وہ اس کا سخت اہتمام کریں گے کہ طلوع سحر سے کچھ منٹ پہلے کھانا پینا بند کر دیں اور غروب آفتاب کے کچھ منٹ بعد افطار شروع کریں۔ اس کا نام انھوں نے "احتیاط" رکھا ہے۔ ایک طرف اوقات روزہ میں احتیاط کا یہ عالم کہ سحری میں تعجیل اور افطار میں تاخیر کی حد تک اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح طور پر سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ میری امت اس وقت تک خیر پر رہے گی جب تک وہ افطار میں تعجیل (جلدی کرتی رہے گی۔ دوسری طرف مقاصد روزہ میں بے احتیاطی کا یہ حال ہے کہ وہ اس کو ضروری نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھ کر کسی کی برائی نہ کریں، کسی سے جھگڑا نہ کریں، منہ سے جھوٹ بات نہ نکالیں۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص روزہ رکھ کر جھوٹ بات کرے تو اس کا روزہ، روزہ نہیں۔ اسی طرح دوسری حدیث میں ہے کہ کوئی روزہ دار کسی مسلمان کی غیبت کرے تو گویا اس نے خدا کی حلال کی ہوئی چیز سے روزہ رکھا اور اس کی حرام کی ہوئی چیز سے افطار کر لیا۔

یہ دونوں واقعات بظاہر ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ ایک جگہ روزہ داری ہے، دوسری جگہ بے روزہ داری۔ لیکن گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو دونوں کی شعوری سطح ایک نظر آئے گی۔ دونوں عبادت یا روزہ کو ایک قسم کا رسمی عمل سمجھ رہے ہیں نہ کہ ایک ایسا عمل جو انسان کی اندرونی گہرائیوں سے نکلتا ہے، جو اس کے پورے وجود کا نمائندہ ہوتا ہے۔

عبادت کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ ایک زندہ عمل ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ محض ایک رسم ہو۔ زندہ عمل آدمی کے پورے وجود سے نکلتا ہے۔ وہ اس کی مکمل ہستی کا ایک اظہار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس رسم کی حیثیت محض ایک بے روح خارجی عمل کی ہوتی ہے۔ آدمی قلب و روح کو اس میں شامل کئے بغیر اوپری طور پر اسے انجام دے دیتا ہے۔ مثال کے طور پر تنہائیوں میں اللہ کو یاد کر کے رونا ایک عبادت ہے جب کہ اپنے دنیوی دھندوں میں مشغول رہتے ہوئے تسبیح کے دانوں پر "اللہ اللہ" شمار کرنا محض ایک رسم ہے۔ تنہائی میں مومن کی آنکھ سے جو آنسو نکلتے ہیں وہ اس کی پوری ہستی کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ جبکہ لفظ "اللہ" کو شمار کرنے والا صرف یہ کرتا ہے کہ پلاسٹک کے دانوں کو مقررہ تعداد میں دھاگے میں پرو دیتا ہے اور اپنے مشاغل میں مصروف رہتے ہوئے محض انگلیوں کی حرکت کے ذریعہ اس کو گنتا رہتا ہے۔ زندہ عمل میں آدمی اور اس کے عمل کے درمیان گہرا نفسیاتی ربط ہوتا ہے جب کہ رسم میں دونوں کے درمیان اس قسم کا کوئی ربط نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ میں روزہ کی حیثیت ایک قسم کی سالانہ رسم کی ہوگئی ہے۔ لوگوں کی اصل زندگی بدستور اپنے ڈھرے پر چلتی رہتی ہے۔ روزہ کا زمانہ آتا ہے تو وہ بس ہجری کیلنڈر کے نویں ماہ میں داخل ہوتا ہے۔ لوگوں کی زندگیوں میں داخل نہیں ہوتا۔ روزہ رکھ کر نہ لوگوں کے دل نرم پڑتے۔ نہ ان کے اندر عجز پیدا ہوتا، نہ جائز اور ناجائز کے معاملہ میں ان کی قوت شاقہ میں کوئی اضافہ ہوتا۔ ان کے نزدیک روزہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک خاص وقت سے خاص وقت تک کھانا پینا بند رکھا جائے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اس طرح بھوکے رہنے سے خدا خوش ہو جائے گا ———— ایسی حالت میں ایک بے روزہ دار کیوں نہ سوچے کہ جب خدا کو خوش کرنے کے لئے کچھ رسم ہی ادا کرنی ہے تو جیسا روزہ کی رسم ویسا تلاوت کی رسم — ایک رسم نہ کی، دوسری رسم کرلی۔ خدا جیسے اس رسم سے خوش ہوتا ہے، اسی طرح وہ دوسری رسم سے بھی خوش ہو جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ روزہ محض ایک خارجی رسم نہیں۔ بلکہ وہ ایک باطنی عمل ہے۔ وہ مومن کی نفسیاتی حالت کا ایک جسمانی اظہار ہے۔ مومن کا مطلب ہے ایک ایسا شخص جو دنیا کی زندگی میں برائیوں سے بچ کر رہے۔ "جو کرنے اور نہ کرنے" کے بارے میں خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کی پابندی کرے۔ روزہ اسی قسم کی پابند زندگی کی مشق ہے۔ روزہ میں کھانا پینا چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو روزمرہ زندگی میں "یہ کرد اور وہ نہ کرد" کے ایک لازمی کورس سے گزار کر اس کو سبق دیا جائے کہ اسی طرح تم کو پوری زندگی گزارنی ہے۔ اسی طرح ساری عمر کے لئے تم کو "روزہ دار" بن جانا ہے جب کہ تم خود اپنے ارادہ سے ایک طرح کی زندگی کو چھوڑ دو اور دوسری طرح کی زندگی کو بالقصد اختیار کرلو۔ روزہ کے مہینے کی پابند زندگی دراصل پورے سال اور ساری عمر کے لئے پابند زندگی کی ایک علامت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے سارے معاملات میں "روزہ داری" کے اسی طریقے پر عمل کرے جو اس نے رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کے معاملہ میں کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو حدیث کے الفاظ میں "اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ کوئی شخص محض اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"۔

اگر روزہ دار لوگ اپنے عمل سے حقیقی روزہ داری کا نمونہ پیش کریں تو غیر روزہ داروں کو ہمت ہی نہیں پڑے گی کہ وہ سوچیں کہ اپنے روزہ کی تلافی کے لئے کسی حافظ صاحب کی خدمات بالمعاوضہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں یہ عمل بالکل مضحکہ خیز دکھائی دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ روزہ کی یہ بے قدری روزہ داروں نے پیدا کی ہے نہ کہ بے روزہ داروں نے۔ بے روزہ دار تو اسی کو روزہ سمجھیں گے جس کا نمونہ روزہ دار دکھا رہے ہوں۔

۱۔ سان فرانسسکو کی پیسفک نیوز اینڈ سروس (Pacific News and Services) کے نمائندہ مسٹر کروبر (A.R. Kroeber) نے "اسلام اور ہندستانی مسلمان" کے مسئلہ پر صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو اسلامی مرکز میں ۲۲ فروری ۱۹۸۸ کو ریکارڈ کیا گیا۔ اس انٹرویو کا خلاصہ الرسالہ انگریزی میں انشاء اللہ شائع کر دیا جائے گا۔

۲۔ حقیقت کی تلاش نامی کتاب کا ہندی ترجمہ چھپ کر آگیا ہے۔ اس کا ہندی نام "سچائی کی تلاش" ہے اس کی زبان بالکل سادہ اور عام فہم رکھی گئی ہے تاکہ ہر آدمی اس کو سمجھ سکے۔ شائقین حضرات اس سلسلہ میں دفتر سے رابطہ قائم کریں۔

۳۔ پاکستان کے ایک کثیر الاشاعت اخبار نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے کہ وہ ہر روز اسلامی مرکز کی کتاب "اللہ اکبر" کے ایک صفحہ کا مضمون نمایاں طور پر شائع کرتا ہے اس کیلئے اس نے ایک خصوصی بلاک بنوایا ہے جس کا نمونہ یہاں درج کیا جا رہا ہے۔



۴۔ نئی دہلی کے ایک مشترک اجتماع (۱۱ فروری ۱۹۸۸) میں صدر اسلامی مرکز نے اسلام کے تصور آخرت پر تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کے دو حصے ہیں۔ بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں ہے اور زیادہ بڑا حصہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں۔ موجودہ زندگی اگلی طویل تر زندگی کی تعمیر کا ابتدائی مرحلہ ہے۔

۵۔ دہلی کے ایک ہندو بزرگ جو الرسالہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں، انھوں نے "حیات طیبہ" کے ۵۰ نسخے خرید کر اپنے حلقہ کے درمیان تقسیم کئے۔ حیات طیبہ قرآن کی منتخب آیتوں کا مجموعہ ہے۔ جو اردو اور انگریزی میں مرکز سے شائع کیا گیا ہے۔

۶۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے کتابوں کی قومی نمائش (National Exhibit) کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے تحت ملک میں چھپنے والی مختلف زبانوں کی کتابوں میں سے ۲۵۰۰ ممتاز کتابوں (Outstanding Books) کا انتخاب کیا گیا۔ یہ منتخب کتابیں مذکورہ مرکزی ادارہ کے تحت دہلی کی عالمی نمائش (فروری ۱۹۸۸) میں رکھی گئیں اور اس کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں ان کی نمائش کا انتظام کیا گیا۔ اس قومی نمائش کے لئے اسلامی مرکز کی متعدد انگریزی اور اردو کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کتابوں کا ذکر نیشنل بک ٹرسٹ مطبوعہ کیٹلاگ میں حسب ذیل صفحات پر موجود ہے: ۲۳، ۵۱، ۱۵۰، ۱۷۰، ۱۷۲۔

۷۔ ایک صاحب اپنے خط (۱۹ فروری ۱۹۸۸) میں لکھتے ہیں: میرے ایک دوست نے الرسالہ کی بہت تعریف کی۔ پڑھا تو واقعی اس کے تمام مضامین پسند آئے۔ الرسالہ کا ایک ایک پرچہ ایک بیش بہا خزانہ کے مشابہ ہے۔ اس لئے میں تو الرسالہ کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالتا ہوں۔ اور جس وقت الرسالہ میرے ہاتھوں میں ہوتا ہے تو میں گرد وپیش سے بے خبر اس میں کھو جاتا ہوں۔ اس کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اندھیرے سے اجالے میں آگئے۔ سطحیت سے سوچنے کے بجائے گہرائی سے سوچنے کی طرف منتقل ہو گئے۔ ایک صفحہ پڑھتے وقت یہ محسوس ہوتا ہے کہ کب یہ پورا ہو جائے اور دوسرے صفحہ پر ہم کوئی دوسرا پیغام پڑھیں مجھے افسوس ہے کہ پہلے میں ایک عرصہ تک الرسالہ کے بارے میں کیوں تعصب کا شکار رہا (ابرار احمد رفعت، سورت)

۸۔ اسلامی مرکز ۱۹۷۰ میں قائم ہوا۔ اس وقت سے اب تک وہ دعوتی اور تعمیری سرگرمیوں میں مسلسل مشغول ہے۔ اسلامی مرکز کی تعمیری مہم کو مؤثر طور پر جاری رکھنے کے لئے آپ کے مالی تعاون کی شدید ضرورت ہے۔ اسی طرح انگریزی الرسالہ کے خسارہ کی تلافی بہت ضروری ہے۔ امید کہ ہمارے ہمدرد اس پہلو پر توجہ فرمائیں گے۔ رقم روانہ کرتے ہوئے مد کی صراحت ضرور فرما دیں۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۴۸ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۵۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نیو کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ـ سورۃ بنی اسرائیل

جلد دوم : سورۃ الکہف ـ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۰۰ روپیہ

جلد دوم ۱۰۰ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

RN 28822/76 D(SE) 243

May 1988 No 138

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدّین خاں کے قلم سے

	Rs
تذکیر القرآن جلد اول	100/-
〃 جلد دوم	100/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	30/-
مذہب اور جدید چیلنج	35/-
عظمتِ قرآن	25/-
الاسلام	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
اسلامی زندگی	20/-
احیاءِ اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	45/-
صراطِ مستقیم	25/-
خاتونِ اسلام	35/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
اسلام اور عصرِ حاضر	20/-
حقیقتِ حج	25/-
اسلامی تعلیمات	20/-
تبلیغی تحریک	15/-
تعبیر کی غلطی	35/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-

دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدیدِ دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملّت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	8/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	3/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	3/-
تعارفِ اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-
ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملّت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	6/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبرِ اسلام	4/-
آخری سفر	4/-

اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیّبہ	4/-
باغِ جنّت	4/-
نارِ جہنّم	4/-
میوات کا سفر	25/-

God Arises	Rs. 45/-
Muhammad The Prophet of Revolution	50/-
Religion and Science	25/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad The Ideal Character	4/-
Man Know Thyself !	4/-
इन्सान अपने आपको पहचान	2/-
सच्चाई की तलाश	4/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳